دامن

(کلیاتِ شعری)

باقر نقوی

maablib.org

دامن

● تازہ ہوا ● مٹھی بھر تارے

● موتی موتی رنگ ● بہتے پانی کی آواز

باقر نقوی

اکادمی بازیافت

پہلی اشاعت : جون ۲۰۰۳ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: ۷۷۵۱۳۲۳
قیمت : ۳۰۰ر روپے
جملہ حقوق محفوظ

Daman

(Poetry)

By: Baqar Naqvi

Kitab Market, Office # 17, St. # 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 7751428
e-mail: mukalama@cyber.net.pk

ترتیب

(ہر مجموعے کی فہرست اُس کے آغاز میں دی گئی ہے)

maablib.org

تازہ ہوا

پہلی اشاعت: مئی ۱۹۸۸ء

maablib.org

والدہ ماجدہ کے نام

مشعلِ جاں لے کے مجھ کو راہ دکھلاتی رہی
اور میں ہوں گی سایہ، میری ماں ہے روشنی
(ب۔ن)

maablib.org

ترتیب

maablib.org

چھپتے چھپتے

جمیل الدین عالی

''تازہ ہوا'' طباعت کی منازل طے کر چکی تھی، سرورق کے ''فلیپ'' پر اظہار رائے کے لیے میں نے محترم جمیل الدین عالی سے درخواست کی، عالی جی کہنے کو کراچی میں رہتے ہیں لیکن دراصل سفر میں رہتے ہیں۔ کئی ہفتے کی تلاش کے بعد اُن سے بات ہوئی تو انھوں نے ازراہِ کرم وعدہ فرمایا کہ وہ ہر چند کہ فلیپ نہیں لکھتے مگر لندن سے آنے والی ''تازہ ہوا'' پر تبصرہ ضرور کریں گے۔ چنانچہ فیکس کے ذریعے باقر نقوی کی آٹھ دس غزلیں عالی جی کو بھیج دی گئیں۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ عالی جی نئے آنے والوں کا راستہ نہیں روکتے بلکہ انھیں راستہ دکھاتے ہیں لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ باقر کے کلام پر اتنی توجہ فرمائیں گے۔
تیسرے دن عالی جی نے باقر کے کلام پر اپنا مختصر تبصرہ تحریر فرما دیا اور ایک قاصد کے ذریعے لندن ارسال کر دیا، اس ہدایت کے ساتھ کہ میں فلیپ کی گنجائش کے اعتبار سے قطع و برید کرلوں۔ تبصرہ پڑھا تو عالی جی کی عالی ظرفی اور تازہ واردانِ بساطِ سخن کی حوصلہ افزائی کے انمول جذبے کا پہلے سے زیادہ اندازہ ہوا۔ ہر چند کہ فلیپ پر اس تبصرے کے اقتباسات پیش کر دیے گئے لیکن میری دانست میں اُن کا ہر لفظ باقر نقوی کے لیے سند ہے۔ لہٰذا پورا تبصرہ شریکِ اشاعت کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ عالی جی کے شکریے کے ساتھ اور اس التماس کے ساتھ کہ کتاب چھپ کر ان کی خدمت میں پہنچے تو ازراہِ کرم وہ تفصیلی تبصرے سے نوازیں تو ان کا باقر نقوی کے ساتھ ساتھ مجھ پر بھی کرم ہوگا۔ (عاشور)

اردو غزل ان الزامات سے تو کبھی کی بری ہو چکی کہ وہ محض کلاسیکی روایات کی اسیر ہے... کہ وہ جدید حسیات مثلاً زوالیت کے خلاف احتجاج اور انقلابی کش مکش کو اپنے سانچے میں رکھتے ہوئے بھرپور جمالیات کے ساتھ ظاہر نہیں کر سکتی۔ فیض صاحب تو کلاسیکی لفظیات سے استفادہ کرتے ہوئے بھی بڑے بڑے معترضین کے منھ بند کر گئے ہیں، آج ایک پوری اور بڑی طاقتور قطار ہے ایسے غزل گویوں کی جو مستند شعری جمالیات کے راستے بھی تغیر کی طرف بڑھتے اور بڑھاتے ہیں، اُن میں ''تازہ ہوا''، جو لندن سے

آ رہی ہے، ایک چونکا دینے والے اضافے کا تحفہ لا رہی ہے۔

مجھ جیسے پرانے چاول کے لیے جو سکہ بند نقاد بھی نہ ہو کسی "نئے" شاعر کے شعری مجموعے پر رائے زنی بڑا مشکل کام ہے۔ شعر کے معاملے میں میرا تقریباً ہر وقت رواں نثری قلم اپنی بے بضاعتی کے دباؤ سے کانپنے لگتا ہے، میری تربیت اور عادت آہ اور واہ کی اظہاری حدود سے گتھی ہوئی ہے جن سے میں بڑے داخلی اور خارجی تقاضوں کے باوجود نکل نہیں پاتا۔ شاید اس لیے بھی مجھے اس وقت تک شعر پر "نقد و نظر" کو اپنا ذیلی پیشہ یا شیوہ بنانے کی فرصت نہیں مل سکی ہے۔

سچ کہ "تازہ ہوا" ایک ذمہ دارانہ تبصرہ مانگتی ہے خواہ وہ فلیپ کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ اس کے وہ شعر جو نمونے کے طور پر میری نظر سے گزرے (اور نہ جانے پورے مجموعے میں کیا کچھ ہو) ایک بڑے جان دار لہجے کی نشان دہی کرتے ہیں، سانچے وہی قافیہ ردیف کچھ پرانی لفظیات بھی، مگر بیشتر مصرعے گرج گرج کر اپنی زبان بولتے ہیں:

زمیں کی جنگ چھڑے گی اب آسمانوں میں

میں باقر نقوی سے معمولی سی بھی واقفیت کا دعویٰ یا اعتراف نہیں کرسکتا۔ انھیں لندن میں ایک آدھ مرتبہ سنا ہوگا وہ بھی روا روی میں۔ لیکن اُن کی جو غزلیں مجھ تک پہنچی ہیں انھیں ایک اہم احتجاجی شاعر ہی نہیں ایک بڑا امکان تسلیم کرنے پر مجبور کر رہی ہیں (معذرت کہ میں شعرائے اردو مقیم مغرب کی پی آر مہمات یا تنازعات میں شریک نہیں ہوا کرتا... تا حال مجھے وہاں روٹی کپڑا مکان... اور ایک شام... اُن کی مہربانی کے بغیر دوسرے احباب کی قدردانی سے مل جاتے ہیں۔ یوں بھی ایسے موقعے پر کوئی صیغۂ مبالغہ استعمال کرنا ایک اچھے قاری کو شاعر کی طرف سے شبہے میں ڈال سکتا ہے)۔

آیئے شعروں کے انتخاب سے شاعر کی... اور چاہیں تو میرے دعوؤں کی... رسوائی یا پذیرائی ہو جائے۔ بعض غزلیں مسلسل نہ ہونے کے باوجود وحدتِ تاثر کے سبب مسلسل لگتی ہیں، ان سے ایک دو شعر کا انتخاب نامناسب ہوگا مگر اس وقت میرے لیے ناگزیر ہے۔

شہر کا لفظ پچھلے بیس برس میں اتنا مجروح کر دیا گیا ہے کہ اس کی معنویت اور حیثیت بگڑ چکی ہے مگر باقر نقوی نے ایک پوری غزل کی ردیف میں لا کر بھی زندہ و تازہ رکھا ہے۔

ناراض ہو کے رات کی پریاں کدھر گئیں
کیوں اِس قدر اُداس سویرا ہے شہر میں
یہ کیا ہوا کہ رنگ سے عاری ہوئے ہیں پھول
بے رنگ تتلیوں کا بسیرا ہے شہر میں
ہر جزر و مد کے ساتھ بدلتا ہے اپنا رُخ
جیسی ہوا ہے ویسا ہی دریا ہے شہر میں

اور کیا یہ شعر کسی بے بسی کا مظہر ہے؟ اے اہلِ ذوق یہ سب کا امتحان ہے۔ دیکھو یہ بات کتنی دُور تک جاتی ہے:

کوئی پوچھے جو کبھی گھر تو اسے گھر کہہ لیں
اور ہم اِن در و دیوار سے کیا مانگتے ہیں

اس غزل میں ایک شعر تمام پرانی علامتوں کے باوجود ایک آہنگ ہو کر اُبھرتا ہے۔ پرانی لفظیات مضبوط ہاتھوں میں آ کر توانا ہو جاتی ہیں۔

کتنے بھولے ہیں ترے شہر کے زخمی پیکر
جو مسیحاؤں کے قاتل سے دوا مانگتے ہیں

فرازؔ دار کا ایک مرکب فیضؔ اور مجروحؔ سے منسوب ہے۔ باقر نقوی ان سے متاثر ہوا ہوگا (اور خود یہ حضرات بھی اپنے پیش رووں سے متاثر ہوئے تھے... اور کون اپنے پیش رووں سے متاثر نہیں ہوتا) لیکن ایک اصطلاح اپنی بنائی اس کی معنیاتی وسعت میں طبقاتی کش مکش کی کہانی واضح تر ہے۔

فرازِ عدل پہ حکام بے ادب دیکھے
گناہگار عجب، فیصلے عجب دیکھے

اس غزل میں ایک اور کہانی... جب کش مکشوں اور قربانیوں کو عارضی سہی بڑی بڑی دل دوز غیر متوقع ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے... یہ داغ داغ اُجالا... پرانی اور تازہ کہانی... لیکن اپنی زبانی...

اگر ہمیں اسی مرکز پہ لوٹ آنا تھا
تو سارے خواب بھی کیا ہم نے بے سبب دیکھے

نہیں... میں اپنی بے بضاعتی اور کم فرصتی میں ایسے دکھوں میں ڈوبے ہوئے غضب ناک اور تہ دار غزل گو پر کوئی تسلی بخش گفتگو نہیں کرسکتا۔ مجھے دوسرے کے بارے میں ژولیدہ بیانی، مبہم بے معنی یا ہم معنی expression پسند نہیں۔ سیدھی سادی زبان میں یہ شاعر مجھے انقلاب کا تجزیہ نگار... اور پُراعتماد پیشین گو لگتا ہے۔ آنے والے ناگزیر کی طرف ڈھکی چھپی ایمائیت کے ساتھ نہیں (گو وہ بھی ایک بڑا مقام ہے) پوری قوت کے ساتھ طاقتور لفظوں کے پرچم ہلا ہلا کر اشارے کرتا ہے۔

اب کے نظر آتے ہیں عجب پیاسوں کے تیور
پانی نہ ملے گا تو پیالہ نہ رہے گا
بے کار زمینوں کو نگل جاتے ہیں جنگل
روکو گے مسافر کو تو رستہ نہ رہے گا

ہاں ایک پرانا چاول سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہی رہے گا، اتنے خراجِ تحسین کے ساتھ ایک اور بات کہنے کو جی چاہ رہا ہے... اگر باقر نقوی کے جواہرِ بیان لفظیاتی تہذیب و ترتیب کی خراد پر کچھ اور چھل جائیں تو زیادہ اچھے لگیں گے اور زیادہ کاٹ بھی کریں گے۔

اکثر شعرا کے لیے انگلستان کے قیام میں کئی خوبیاں بھی ہیں مگر ایک کمی بھی، وہ کمی رفتہ رفتہ پوری ہوتی جاتی ہے لیکن تاحال موجود ضرور ہے... اور وہ ہے خوش نیت فاضل اہلِ نظر کا مسلسل inter-action نہ ہونا۔ ایسا inter-action بالآخر ایک غیرمحسوس مگر دُور رس خود تنقیدی کے مواقع اور ماحول فراہم کرتا رہتا ہے اور classy شعرا تو پاک و ہند، آ آ کر ایسی صحبتوں میں ایک لازمے کے طور پر وقت گزارتے رہے ہیں، باقر نقوی ایک classy شاعر ہونے کے بڑے امکان رکھتا ہے، نہ جانے اس کی کیا عمر ہے، کیا پیشہ ہے، وہ اپنے وطن میں کیوں نہیں رہتا... انگلستان میں اردو شاعری کم زور نہیں لیکن اگر وہاں مستقل رہنے والے اردو شعرا چند برس اور پاک و ہند کے اردو ماحول کے دریاؤں میں غوطے کھاتے رہیں تو بہت خوب صورت تیریں گے۔

ایک بار پھر چند شعر سامنے آتے ہیں اور باقر نقوی کے امکانات ہی نہیں (مجھے تواتر استعمالِ "امکانات" پر کوئی افسوس نہیں) بلکہ اس کے "منفرد" کمالات بھی دکھاتے ہیں، تلخیوں، تنبیہوں، عزائم کا ایک دھارا ہے جو تیز بہہ بہہ کر پھیل رہا ہے:

اُگے نہ موت زمین پر تو اور کیا ہوگا
کہ بیج زہر کے بانٹے گئے کسانوں میں

کچھ اور تازہ رنگ بھروں کائنات میں
اے جذبۂ خیال نئے پر لگا مجھے

جاری ہو نغمۂ حیات تارِ رباب کچھ تو بول
کب سے ہے منتظر بہار، میرے گلاب کچھ تو بول

یہ آدمی غزل میں انسانی جدوجہد کی تاریخ کیسی دل میں اُتر جانے والی اور حوصلہ بڑھانے والی تبلیغ کے ساتھ بیان کرتا ہے:

کمال پانیوں کا تھا کہ راستے بنا لیے
ندی کی راہ میں مہیب کوہسار کب نہ تھا

یہ آدمی کس چیلنج کے ساتھ میدان مانگتا ہے:

یہ کیا کہ اک اُڑان ہی میں کٹ گئیں مسافتیں
عطا کیے ہیں بال و پر تو ہم کو آسماں بھی دے

یہ آدمی غزل کی مخصوص جمالیات میں انقلاب کے آداب کس اعتماد، کس دانش کے ساتھ بتاتا ہے۔

سبک سری میں بھی اندیشۂ ہوا رکھنا
سنگ اُٹھے ہو تو جلنے کا حوصلہ رکھنا

اور اس غزل میں دوسرے عجیب عجیب رنگ بھی ہیں۔ ہماری پرانی زبان میں کس قادرالکلامی کے ساتھ... کس قدر تلخ... کتنی سچائی کے ساتھ تلخ ہو جاتا ہے:

یہ زینتیں بھی عجب ہیں یہ سادگی بھی عجیب
ریا کے سارے ہنر جسم پر سجا رکھنا

نہ جانے کون سا کس وقت کام آ جائے
سو ایک جیب میں بت ایک میں خدا رکھنا

اور اس گھٹن میں اوّلیت کس مطالبے کو دیتا ہے:

پھول ہم نے کبھی مانگے نہ صبا مانگتے ہیں
ہم تو جینے کے لیے تازہ ہوا مانگتے ہیں

اور اس جبر و جور پر کیسے سوال کرتا ہے، ایسے سوال ازل سے اب تک ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے سو اس نے بھی کیے... مگر اپنی زبان میں... اپنے طنطنے کے ساتھ:

تو خدا ہے تو ہمیں بھی ہے انا کا پندار
حق سمجھتے ہیں جو ہم تجھ سے دعا مانگتے ہیں

جسم پہ لگ رہے ہیں زخم نیزۂ اعتبار کے
اے مرے ہوش کچھ تو کہہ، اے مرے خواب کچھ تو بول

نہ جانے کب سے ہم پہ قرض ہے جنوں کی داستاں
سلیقۂ بیاں دیا تو اب ہمیں زباں بھی دے
لگاؤ دوستو دلوں میں ایسے آگہی کی آگ
جو گرم جسم کو رکھے کبھی کبھی دھواں بھی دے

کاش جب یہ پوری کتاب آئے تو میں اس پر کچھ لکھ سکوں۔ ایسے کاٹ دار لہجے کا شاعر جب پورے قد و قامت کے ساتھ سامنے آ کر آواز لگاتا ہے تو... تو بڑے بڑے پہاڑ ہل جاتے ہیں۔ فی الحال تو میں ممنون ہوں عاشور کاظمی کا کہ باقر نقوی سے اتنا ہی تعارف کرا دیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر، لندن سے تین اہم اردو کتابیں شائع کر چکا ہے، پہلے انگلستان سے اردو تخلیقات کی اشاعت باقاعدگی اختیار نہیں کر پائی تھی، اب آثار نظر آتے ہیں کہ یہ سلسلہ آگے ہی بڑھتا رہے گا، ''تازہ ہوا'' اس سلسلے کی ایک مضبوط کڑی لگتی ہے۔

کراچی، ۲۵/اپریل ۱۹۸۸ء

کئی باتیں

پروفیسر ڈاکٹر سیّد محمد عقیل رضوی

فکر و نظر کی نئی آگہی نے اِدھر انسان کو پھر سے اپنی بدلتی ہوئی قدروں کی تلاش کی طرف متوجہ کیا ہے۔ نئے سائنسی حقائق جس طرح روز، ایک نیا انکشاف کرتے جاتے ہیں اُسی طرح، ذہنِ انسانی اپنے غم و نشاط، اپنے احساسِ جمال اور اپنے محسوسات کے لیے اظہار کے نئے طریقے دریافت کرتا جاتا ہے۔ کمپیوٹر اور روبٹ کی برق رفتاری نے نہ صرف اس کی مشینی دنیا کو متزلزل کر دیا ہے بلکہ اس کی سوچ کے ادب اور ادراک خیال میں بھی ایسا محشرستان برپا کر رکھا ہے کہ شعر و ادب کی دنیا میں یہ صورت پہلے کہاں تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ آج سے کچھ دنوں پہلے تک غزل، جسے حالیؔ سے لے کر ترقی پسندوں تک نے اردو شاعری کے دورِ ازل کا سرمایہ سمجھ رکھا تھا، دیکھتے دیکھتے اردو ادب کی دنیا پر پھر سے حاوی ہوگئی۔ روز، نت نئے انداز کی غزلیں، نئی گلاسری اور نئے انداز سے سوچتی ہوئی، ایوانِ غزل میں داخل ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ غزل کی یک بارگی بازآفرینی کیوں اور کیسے ہو رہی ہے اور غزل روز نئے موڑ، نئے مسائل اور نئی گلاسری کیوں بدل رہی ہے، اس کا تجزیہ ہونا چاہیے۔ ایک بہت واضح موڑ اردو غزل میں اردو کے شعرائے مہجر کا ہے۔ وہ شاعر جو ہندوستان اور پاکستان سے نکل کر اطرافِ عالم میں پھیل گئے ہیں۔ جن کے ساتھ ان کا قدیم کلچر بھی ہے اور جدید بھی۔ ان میں وہ بھٹک

بھی ہے جو انھیں لیے پھرتی ہے اور تجربوں و تہذیب غم کی نئی دنیا بھی جو ایسے تمام لوگوں کی اپنی دنیا ہے۔

باقر نقوی کا مجموعہ ''تازہ ہوا'' مجھے ملا تو غزل کی ایسی ہی دنیا ان کے اشعار میں مجھے نظر آنے لگی اور چونکہ میں ان کی جڑوں، ان کے منتقل ہوتے ہوئے ماحول، ان پر پڑی ہوئی تمام چتا سے واقف تھا، اس لیے ان کے اشعار میں مجھے وہ تمام صورتیں سر جھکائے، سر اٹھائے اور متوحش و بے چین نظر آنے لگیں۔ میں پہلے سمجھا تھا کہ وہ اپنے گھر کے پرانے لوگوں کی طرح محض تفننِ طبع کے لیے شعر کہتے ہوں گے کہ محفل سازی بھی شاعری کی ایک منزل رہ چکی ہے۔ یہ ایک جملۂ معترضہ ہے مگر آج بھی مغرب میں محض ''تفننِ طبع'' کے دل دادہ موجود ہیں۔ ایسے خاصے بھولے بھالے لوگ برطانیہ، امریکا اور کنیڈا میں ہیں جو اردو شاعری کی حشر سامانیوں سے بے خبر ہیں اور جس تہذیب اور رنگِ شاعری کے دور میں انھوں نے ہجرت کی تھی، وہ سمجھتے ہیں کہ وہی تہذیب اور رنگِ شاعری آج بھی اردو شاعری کا غالب رنگ ہے اور اسی رنگ میں شعر کی تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ مگر باقر نے ایسے سن و سال میں ہجرت کی تھی کہ انھیں خبر بھی نہیں کہ اس وقت محفل سازی کی شاعری کیا تھی۔ ہاں، اس زندگی کی یاد ضرور باقی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ تجربہ بھی جو انھیں کھوکھراپار سے کھینچتا ہوا کراچی اور پھر لندن لے گیا۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو یہ شعری تجربہ کہاں سے آتا۔

حرکت میں ہے دنیا لیکن پتھر ہے
پتھر کے اندر رقصندہ ہم ہی تو ہیں

پیڑ کاٹے گئے، پھول روندے گئے بہتے دریاؤں پر بند باندھے گئے
جانے کتنے بسیرے اُجاڑے گئے تب بسائی گئی ہیں نئی بستیاں
کنبہ چھوڑا بستی چھوٹی جنگل ہو گئے ہم
جاناں تیرے پیار میں کیسے پاگل ہو گئے ہم

باقر نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ وہ اپنے تجربات کو نالہ و فریاد کی طرح بیان نہ کریں۔ جو کچھ ان پر بیت گئی، اس کا مداوا کیا ہوسکتا ہے؟ پھر ہائے واویلا مچانے سے کیا؟ جو گھر لٹ گیا، جو زمین چھوٹ گئی، جو آم کے باغ اور چنے کے کھیت ان سے بچھڑ گئے انھیں کون واپس لاسکتا ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں اس تہذیب کیے ہوئے غم کی بازگشت ہے جو برداشت کر لینے کے بعد ایک ایجابی احتجاج کے ساتھ اُبھرتی ہے، جسے سنانا مقصود نہیں ہوتا مگر ''ہم نے بھی یہ کچھ برداشت کیا ہے۔ لوگو! تم سن کر کیا کروگے تاہم یہ ہمارا تجربہ، ظرف اور غم کو حرزِ جاں بنانے کا طریقہ دیکھو۔'' جیسا آہنگ اور اشارہ ان غزلوں میں بولتا سنائی دیتا ہے۔ تمام ہجرت کرنے والوں کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں یہ کیفیت ابھرتی ہے مگر باقر نے اسے دبا کر، جو اپنے الفاظ اور مصرعوں کے چہروں سے عیاں کرنے کی فکر کی ہے، وہ ان کی اپنی منفرد کوشش ہے۔ وہ کہیں vocal نہیں ہوتے اور نہ ''ہائے سب لٹ گیا۔ ہم بے گھر ہوگئے'' والا expression ملتا ہے۔

گھر سے نکلے تو یہ غم تھا بے گھر ہوگئے ہم
تیری بستی میں پہنچے تو پتھر ہوگئے ہم

جن پہ لٹکے ہوئے اک عمر گزاری ہم نے
ان صلیبوں پہ ذرا کوئی مسیحا چمکے

لوگ کوئی تصویر لیے پھرتے ہیں گلی گلی
ہم کو بھی وہ چہرہ کبھی دیکھا سا لگتا ہے

سوادِ شام میں گم ہوگئے چراغِ اُمید
نگاہِ وقت نے کیا حادثے غضب دیکھے

پھول ہم نے کبھی مانگے نہ صبا مانگتے ہیں
ہم تو جینے کے لیے تازہ ہوا مانگتے ہیں

خودبخود جل اٹھے یادوں کے دریچوں میں چراغ
رات پھر جاگ اٹھا درد پرانا دل کا

مگر باقر نے کلاسیکی پابندیوں کا لحاظ رکھا ہے۔ خیالات اور الفاظ کی حدیں یقیناً پرانے رکھ رکھاؤ کو توڑ دیتی ہیں مگر، الفاظ کا دروبست، بحروں کی پابندی، الفاظ کے اعراب وہ اس طرح نہیں توڑتے جس طرح جدید اور بہت سے نئے شعراء کچھ تو تجربوں کے لیے اور زیادہ تر ناواقفیت کے سبب، زبان کی شکست و ریخت کے عمل میں سرگرم ہیں اور اسے سراہتے بھی ہیں۔ زبان کے دائرے، اعراب و اصوات اگر زبان کے اصولوں کے ساتھ تبدیلی اور شکست و ریخت کی منزل سے گزریں اور یہ تبدیلی فطری ہو تو شعری زبان کا ارتقا ہوتا ہے مگر لاعلمی اور من مانی کیفیت، شاعری اور زبان، یہاں تک کہ شاعر کے فکری عمل کو بھی بے مصرف کر دیتی ہے۔ یہی صورت استعارات کی بھی ہے۔ نئی زندگی اپنے نئے استعارات اور علامتیں بنا سکتی ہے اور بناتی بھی ہے مگر اس عمل میں کسی بھی زبان کی شعری روایت کو یک قلم پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا اور تمام تلازمے اور استعارے شخصی طور پر اور isolation میں پیش نہیں کیے جاسکتے۔ یہ ضرور ہے کہ شاعر ان کے مطلعے (Spheres) اور اشاریت کو بدل سکتا ہے اور بدلتا بھی ہے۔ اس سے نئی معنوی وسعتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور نئے تلازموں کا صَرف بھی شاعری کی دنیا میں داخل ہوتا ہے مگر اس میں زبان کے مزاج، اس کی assimilation کی طاقت اور تمام تر حدود و توسیع کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ باقر نے ہوا، پرندہ، پھول، گرد، دریا، دھوپ اور برف کو جس طرح تلازمۂ خیال کے لیے استعمال کیا ہے اس میں ہر لحظہ ایک نئی معنویت اور ماضی و حال کی زندگی کے ممکنات ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی غزلیں زبان و بیاں دونوں کی نئی معنوی تہیں ابھارتی جاتی ہیں۔

ہر دور کا شاعر اپنے دور کے آہنگ، فیشن اور آگہی کو کہاں چھوڑ سکتا ہے؟ کیوں کہ تمام تحریریں ایک وقت اور تاریخ کے ساتھ وجود میں آتی ہیں جن میں فیشن ادیب اور شاعر کو ڈھکاتا ہے۔ اگرچہ یہ فیشن کبھی کبھی بڑے دھوکے باز (Illusive) بھی ہوتے ہیں اور ضروری بھی نہیں کہ تاریخ اور وقت کی سچی حقیقتیں بھی ہوں مگر شاعر اور ادیب اس کی طرف کھنچتے ضرور ہیں۔ پھر سچی حقیقتیں اور تجربے بھی اب طبیعیات، مابعدالطبیعیات، ایٹمی تجربوں اور اِکسرے کی گہرائی سے آتی ہوئی تجرباتی زندگی سے آتے ہیں کہ کہاں کہاں ادیب یا شاعر تسلیم شدہ قدروں کے ساتھ چلے اور پھر کن مسلمات کی قدروں کے ساتھ روایت سے الگ بھی ہوجائے۔ اردو کی نئی شاعری میں کچھ لوگ نئے مسلمات اپنا کر اپنے طور پر الگ ہو بھی گئے مگر کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ جنھیں وہ نئے شعری مسلمات سمجھتے تھے، وہ ایجادِ بندہ اور محض لمحاتی دلچسپیوں سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ کچھ تذبذب میں بھی رہے مگر میرا خیال ہے کہ جنھوں نے زبان اور بیان کے کینڈے کو بدلا اور اس بدلنے میں فیشن کے ساتھ ساتھ اردو کی شعری روایت اور اس کے مزاج اور حرمت کا خیال رکھا ہے، انھوں نے اردو شاعری کے شعری ارتقا میں مدد کی ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنا ماڈل ایسے شعرا کو بنایا ہے جو اگرچہ نئے تھے مگر اردو غزل کی شعری تحریم کا لحاظ کرتے رہے ہیں۔ باقر کی غزلوں پر اپنی آواز کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی، شکیب جلالی اور کہیں کہیں منیر نیازی کی گہری چھاپ بھی نظر آتی ہے اور فیشن ان کا غزل کا نیا فیشن ہے۔ زبان کے معاملے میں وہ کبھی کبھی جمیل الدین عالی، ناصر شہزاد اور ابنِ انشا کی طرف بھی دیکھ لیتے ہیں مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوتی کہ وہ کلاسیکی رکھ رکھاؤ چھوڑ نہیں پاتے ہیں۔ یہی سب صورتیں باقر کی غزل گوئی کا واضح نشان مجھے معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں وہ نئی شعری روایت بھی ہے اور مسلماتِ شاعری کی تحریم بھی جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ اب باقر کے کچھ منتخب اشعار دیکھیے:

ہے گیسوؤں کا فیض جو نم ہے گھٹاؤں میں
خوشبو ترے بدن کی گھلی ہے ہواؤں میں

مٹ کر ہوا جو اور تماشائے روزگار
میں وہ نوشتۂ ورقِ آبدیدہ ہوں

میں بھی ترے سپاس کا امیدوار ہوں
میرا بھی ایک تار ترے پیرہن میں ہے

ہم اپنے لیے آپ ہی بن جائیں گے سایہ
دیوار کے سایے پہ بھروسا نہ کریں گے

خوشبو تری گلی میں پریشاں ملی ہمیں
کیا پھر اُلجھ پڑا ترا آنچل ہوا کے ساتھ

روشن ہے کوئی بام، نہ شمعیں ہیں دروں میں
کیوں لوگ چھپے بیٹھے ہیں کاغذ کے گھروں میں

کیسا یہ شہر ہے کہ جو آباد ہے مگر
دیکھو بلندیوں سے تو صحرا دکھائے دے

کس کو چاہوں، کس سے بولوں، خول سے کیسے نکلوں
گھر کے اندر چپ کا جادو، باہر تیز ہوا ہے

باقرؔ جی خوش قسمت ہو تم کوہِ نور پہ بیٹھے ہو
چپ کی کالی جھیل میں دیکھو کتنے سخنور ڈوب گیے

سنا ہے اب کے برس برف گر رہی ہے بہت
تمھارے باغ کے سب پھول جل گئے ہوں گے

سوادِ شام میں گم ہوگئے چراغ اُمید
نگاہِ وقت نے کیا حادثے غضب دیکھے

یہ سب تو ہے مگر باقؔر میاں فکر میں تھوڑی اور گہرائی پیدا کرو، دل کو کچھ اور جلاؤ، تب داستانِ دل، اپنے وقت کی آواز میں بیان کرو۔ پھر دیکھو کہ تم کہاں ہو۔ اچھی شاعری، خودنگری اور خود احتسابی سے وجود میں آتی ہے، مشاعرے کی واہ وا سے نہیں۔ مشاعرہ لوٹ کامیابیاں ادب کے میدان میں شاعر کو اکثر پیدل کر دیتی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ تم مشاعرہ لوٹ شاعر ہو اور تمھارا یہی ایک مجموعہ تمھیں ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو۔ میں یہ بددعا تمھیں نہیں دے سکتا۔

شعبۂ اردو الٰہ آباد یونی ورسٹی

۲۵/ جون ۱۹۸۷ء

معاف کیجیے گا

سیّد عاشور کاظمی

اس کتاب کے پیش لفظ میں گرامیِ مرتبت پروفیسر ڈاکٹر عقیل رضوی نے ایک دل لگتی بات کہی ہے کہ:

> ایسے خاصے بھولے لوگ برطانیہ اور کینیڈا اور امریکا میں ہیں جو اردو کی حشر سامانیوں سے بے خبر ہیں اور جس تہذیب اور رنگِ شاعری کے دور میں انھوں نے ہجرت کی تھی، وہ سمجھتے ہیں وہی تہذیب اور رنگِ شاعری آج بھی اردو شاعری کا غالب رنگ ہے اور وہ اس رنگ میں شعر تخلیق کرتے ہیں۔

جہاں محترم عقیل رضوی کا یہ کہنا درست ہے، وہاں یہ بات بھی غلط نہیں کہ ایسے بہت سے بھولے لوگ ''بین السطور'' پر توجہ نہیں فرماتے۔ لہٰذا برطانیہ کے حوالے سے اگر محترم عقیل رضوی کے ارشاد کو کلیہ قرار دے دیا جائے تو ایک طرف عقیل صاحب کے ساتھ زیادتی ہوگی اور دوسری طرف ایسے بہت سے لکھنے والوں کی حق تلفی ہوگی جو یہاں کے مشینی اور سرمایہ دارانہ نظام میں رہ کر بھی انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں اور روزمرہ مشاہدات اور زندگی کے تلخ حقائق سے ادب کو متصل اور مسلسل رکھتے ہیں۔

چوں کہ باقر نقوی اس (تعداد میں کم لیکن زندگی کے معنی سے آشنا) گروہ سے تعلق رکھتے

ہیں، لہٰذا باقر کے نام کے ساتھ اس مکتبہ فکر و احساس کا حوالہ بھی ناگزیر ہے، میری بات کو عقیل صاحب سے اختلاف کی بجائے بین السطور کی وضاحت سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ بات ''بھولے پن'' یا ''بے خبری'' کی نہیں بلکہ شدتِ احساس کی کمی اور ''فکری تن آسانی'' کی ہے۔ جس دور میں محبت کے مارے بہت ہی معزز، معتبر اور مسلمہ اساتذہ کی رگِ جاں پر ستاروں کی چمک سے چوٹ پڑتی تھی اُسی دور میں محترم احمد ندیم قاسمی کی روح کے تار مشاہدات کی ضرب سے جھنجھنا اُٹھتے تھے اور وہ کہتے تھے:

دو بیگھ زمیں کاشت کی خاطر مجھے دے کر
تم کرتے ہو چھپ کر مری لڑکی کو اشارہ
محنت تو بکا کرتی ہے غیرت نہیں بکتی
افلاس کا مارا ہوا دہقان پکارا

زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ شاعری اُس دور میں بھی ہوئی ہے جسے عقیل رضوی صاحب نے بجا طور پر تفننِ طبع کی شاعری کا دور کہا ہے۔ آج کے ''نیو کلائی جنگ'' اور اسلحہ کے خوف سے لرزیدہ معاشرے میں بھی ہو رہی ہے۔

گزشتہ نصف صدی کے ادب میں جہاں تفننِ طبع کی شاعری کے انبار لگے ہیں۔ وہاں ترقی پسند شاعروں کی شاعری مثلاً جوش کی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی سے خطاب''، سردار جعفری کی ''سامراجی لڑائی''، وامق جونپوری کی ''نیلا پرچم''، ساحر لدھیانوی کی ''پرچھائیاں''، راہی معصوم رضا کی نظم ''دھرتی کے سوکھے چتوں پر امن کا رس ٹپکاؤ''، مخدوم کی نظم ''جنگ''، فیض کی ''ایرانی طلبہ سے خطاب'' اور ''کم بیک افریقا'' اور کیفی اعظمی کی ''کوریا کا نعرہ'' وہ زندہ مثالیں ہیں جن سے اردو شاعری کا بھرم ہے۔ یہ نظمیں اور اسی قبیلے کے بہت سے لکھنے والوں کا کلام ایسا آئینہ ہے جس میں گزشتہ پچاس سال کے واقعات کا چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ تیزی سے بدلتی قدروں سے زمانے میں بھی (عقیل رضوی کے الفاظ میں) بہت سے ''بھولے لوگ'' بے حسی کی فصل بوتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ اُن کی آنے والی نسلوں کو یہ فصل کاٹنی ہوگی۔ کوئی یہ

نہیں سوچتا کہ تفننِ طبع کی شاعری کرنے والے اپنے دور کے کیسے کیسے جغادری دیکھتے ہی دیکھتے مر چکے ہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ اُن میں سے کسی کے کلام پر بھی محترم گوپی چند نارنگ نے مقدمہ نہیں لکھا تھا۔

باقرؔ نقوی، غزل کے شاعر ہیں۔ کچھ بھولے لوگ غزل کو صرف عشق و محبت تک محدود رکھنے پر مصر ہیں۔ شمع اگر بول سکتی، پروانے کو اگر اذنِ گویائی مل جاتا، گلشن اور پھولوں کو اگر زبان میسر آجاتی تو مجھے یقین ہے کہ یہ سب لندن کے ہائیڈ پارک کارنر میں جمع ہوکر اپنے ساتھ ناروا سلوک پر احتجاج کرتے یا پھر بہت سے شاعروں کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کر دیتے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ غزل کا خمیر محبت سے بنا ہے لیکن محبت کے کتنے زاویے ہیں، کتنے اندازے ہیں، فکرِ ہر کس بہ قدرِ ہمتِ اوست، بلکہ یوں عرض کروں کہ فکرِ ہر کس بقدرِ ظرف اوست والی بات ہے۔ محبت کا دعویٰ تسلیم۔ لیکن محبت کس سے؟ دولت سے محبت؟ جاہ و حشم سے محبت؟ بنی نوعِ انسان سے محبت؟ یا کسی پسندیدہ محبوب سے محبت؟ بات ذرا آگے بڑھے تو محبوب کون؟ مجازی (یعنی غیر حقیقی) یا حقیقی، یہ اصطلاح اہلِ تصوف نے دی کہ انھوں نے حقیقی کو روحانیت کی نگاہوں سے دیکھا اور یہی اس کے مروجہ معنی قرار پائے لیکن کیا، حقیقتِ کل، کی موجودگی میں روزمرہ کی حقیقتیں مجازی کہلائیں گی؟ پھول کا کھلنا بھی ایک حقیقت ہے خواہ تھوڑی دیر کے لیے ہو۔ بادِصبا کے نرم جھونکے، گلاب کی مہک، طلوع و غروبِ آفتاب کا تواتر، صبح کے بعد شام اور رات کے بعد صبح، کیا یہ روزمرہ کی حقیقتیں نہیں؟ مگر اہلِ نظر صوفیا نے اسے مجازی قرار دیا اور اس کی دلیل یہ کہ سب چیزیں عارضی ہیں۔ تغیر پذیر ہیں، فانی ہیں، حقیقی وہ جو لافانی ہو۔ یہ بات اگر مان لی جائے تو بات بہت دُور تک جاتی ہے (میرا مقصد تصوف سے اختلاف نہیں، اس لیے کہ ابتدا میں تصوف بھی اسلام میں چور دروازے سے گھس آنے والی شہنشاہیت کے خلاف احتجاج اور ملوکیت سے اجتناب کا ایک محفوظ طریقہ تھا، اس کی وضاحت پھر کبھی سہی)۔ اب تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں عقائد کی پاکیزگی کے احترام کے مدِنظر صرف ''مجازی'' مثالیں دینا چاہتا ہوں اور اپنے علم میں اضافے کے لیے سوال کرنا

چاہتا ہوں کہ ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے کا انسانیت سوز سانحہ بھی تو ایک واقعہ تھا جو گزر گیا۔ کیا تاریخِ انسانی میں یہ واقعہ ایک عُبرت ناک حقیقت بن کر یاد نہیں رہے گا؟ شطیلہ اور صابرہ میں اسرائیلی درندگی کے لگائے ہوئے زخم کیا ذہنِ انسانی بھول سکے گا؟ ایسے بہت سے واقعات کو آپ الم ناک حقیقت کہیں گے یا مجازی واقعات؟ میں کسی فکر کی نفی نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی خوش عقیدہ نیک انسانوں کے جذبات مجروح کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں اور اس نکتے کو سمجھنا چاہتا ہوں کہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو محسوس کرنے کی عادت، صلاحیت اور احساس کے بغیر کسی ''حقیقتِ کُل'' کو پہچاننے کا ادراک کیسے حاصل ہوتا ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے لیکن اس جذبے کا اظہار، اعلان، اقرار یا انکار احساس کی شدت کے سانچوں میں ڈھل کر ہی ہوتا ہے۔ باقر نقوی کی یہ ادا مجھے پسند ہے کہ انھوں نے غزل کی زبان میں (یعنی محبت کی زبان میں) ان تمام زاویوں کا احاطہ کیا ہے۔ انھیں محبوب کی زلفیں اچھی تو لگی ہیں لیکن وہ ان کی چھاؤں میں سو کر زندگی کے تقاضوں سے یکسر غافل نہیں ہوئے۔ زندگی کی کٹھن راہوں پر سرگرم باقر کے دل میں محبت کی کسک سفر کی صعوبتیں جھیلنے میں اُن کی مددگار ثابت ہوئی ہے۔ محبت اُن کے لیے نصب العین یا منزل نہیں زادِ راہ ہے۔

آج سے سات سال قبل سیّد سبطِ حسن مرحوم نے (۲۳ مئی ۸۱ء کو) میرے غریب خانے پر دورانِ گفتگو ایک بات کہی تھی کہ برصغیر ہندو پاک کے بعد لندن اردو کے تیسرے مرکز کی حیثیت سے اُبھر رہا ہے۔ سات سال کے قلیل عرصے میں سبطِ حسن مرحوم کی یہ پیش گوئی ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ چکی ہے اور آج مغرب کے اُفق اُردو پر جو ستارے جگمگا رہے ہیں اُن میں لندن کا contribution سب سے زیادہ ہے۔ آج ''تازہ ہوا'' کی اشاعت سے لندن کے اردو اُفق پر ایک اور روشن ستارہ نمودار ہوا ہے جس کا نام باقر نقوی ہے۔

باقر نقوی ۱۹۶۷ء سے مشقِ سخن کر رہے ہیں لیکن ''تازہ ہوا'' کے حوالے سے ان کے وجود کا اعلان میں ''سیانوں'' کے فرمان کے مطابق کر رہا ہوں۔ یادش بخیر، ایک

باکس آفس ہٹ (box office hit) نقاد نے ایک زمانے میں جب وہ ہم پر بہت مہربان تھے، ازراہِ محبت ایک پتے کی بات بتائی تھی کہ جب تک کسی شاعر کا دیوان شائع نہ ہو جائے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اور کوئی اُس کے کلام پر توجہ نہیں دیتا۔ بس اُسی دن سے مجھ پر ہر صاحبِ دیوان شاعر کا رعب طاری ہوگیا۔ (مع ڈاکٹر محمود دیوان کے)۔

''دیوانوں'' کے اس ہجوم میں بہت سے دیوان نظر نہیں آئے لیکن کیوں کہ کتابی صورت میں تھے اس لیے اُن پر ایمان لازمی تھا۔ ہوسکتا ہے ''دیوان'' کی اشاعت سے قبل برصغیر کے اردو دان طبقے نے اخبارات و رسائل میں باقر کا کلام اس لیے نہ پڑھا ہو کہ وہ صاحبِ دیوان شاعر نہیں تھے اور ان کے لیے کسی پیشہ ور مستند ناقد نے دیباچہ بھی نہیں لکھا تھا اندریں حالات برصغیر کے اہلِ اُردو کے لیے باقر کا نام ایک نیا نام ہوسکتا ہے لیکن برطانیہ میں اردو کے حوالے سے زندہ شاعری کا باب باقر نقوی کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

برطانیہ ایسا ملک ہے جہاں ہر شخص کو آزادیِ تحریر و تقریر حاصل ہے۔ اگر انسان کے اپنے اندر چور نہ ہو اور اس کی ذات کے اندر ٹوٹ پھوٹ نہ ہو رہی ہو تو وہ برملا بات کہہ سکتا ہے۔ ہاں کسی ''مکمل آدمی'' کو گم نام پرچے بازی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ آزادیِ تحریر و تقریر کے باوجود گم نام پرچے بازی کے اس شہر میں ہمارے ایک شاعر دوست برملا کہتے ہیں کہ باکس آفس ہٹ نقاد حضرات کو لندن میں صرف وہی شاعر نظر آتے ہیں جو انھیں لندن بلا کر ان کے لیے بڑے بڑے استقبالیہ جلسے کریں یا جلوس نکالیں۔ باقر نقوی تو اس معاملے میں کورا کاغذ ہیں۔ میری کم مائیگی کہ جلسے کرنا یا کسی کا جلوس نکالنا میرا پیشہ نہیں ہے اس لیے میں اس فن سے نابلد ہونے کے ناتے اپنے دوست کی پہلی بات پر تو تبصرہ نہیں کرسکتا البتہ ان کی اس بات سے متفق ہوں کہ باقر نقوی P.R کے معاملے میں کورا کاغذ ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اس کورے کاغذ پر کئی پیشہ ور فن کاروں نے اُن کی شاعری کی عظمت کے قصیدے لکھنے کی آڑ میں اپنی ''فن کاری'' اور ''چابک دستی'' کا مظاہرہ کرنا چاہا مگر اس مردِ قلندر نے اپنا دامن سمیٹ لیا اور اپنی

آزادیٔ نفس اور اپنے کردار کو ہر آلودگی سے بچا لیا۔

لندن میں اردو اپنے پورے جاہ و جلال، پورے وقار اور ساری روایات کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ کم و بیش ربع صدی سے یہاں جزوقتی اور ہمہ وقتی انجمنیں اردو کی ترویج کے لیے کام کر رہی تھیں جن کی اساس نمائش سے زیادہ خلوصِ مقصد پر تھی۔

ان تمام اداروں میں ایک کمی تھی، ان کا محکمہ تعلقاتِ عامہ یا سرے سے تھا ہی نہیں یا پھر بے حد کم زور تھا اور پھر یوں ہوا کہ جوں ہی اردو مارکیٹ میں ایک ڈیپارٹمینٹل اسٹور کھلا ان تمام جزوقتی اسٹالوں اور ہمہ وقتی دکانوں کے گاہک ٹوٹ گئے۔ ڈیپارٹمینٹل اسٹور کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ کی کارکردگی اس درجہ مقبول ہوئی کہ نہ صرف گاہک بلکہ بہت سے دکان داروں کا کعبۂ مقصود بھی ڈیپارٹمینٹل اسٹور کی نمائش و نمود ہوگئی ہمیں اس ڈیپارٹمینٹل اسٹور سے کوئی حسد نہیں نہ ہی ہمارا تعلق اس کے حامی یا مخالف گروہوں اور غیبت کدوں سے ہے، البتہ بہت سے اردو والوں کی طرح ہمارے دل میں بھی اکثر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ہم بھی ایسا ہی ایک ڈیپارٹمینٹل اسٹور قائم کریں۔ جس میں نفع و ضرر اور سود و زیاں کا پورا حساب رکھا جائے۔ جہاں قلم، زبان، دستار، نفس ہر چیز کی خرید و فروخت ہو اور آنے جانے والوں کے نفس نفس کا باقاعدہ حساب ریکارڈ کیا جائے ''تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آوے''۔ اس اسٹور کی اتنی پبلسٹی کی جائے کہ مقامی لوگوں کے علاوہ باہر سے آنے والوں کا ''جزو ایمان'' ہو کہ ہمارے اسٹور میں آ کر تصویر کھنچوائیں اور وطن واپس جائیں تو ''لندن یاترا'' کی سند کے طور پر اس تصویر کی نمائش کر سکیں۔ لیکن صاحب ایسے ڈیپارٹمینٹل اسٹور کے لیے تو کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں بھی ایسے خوش نصیب لوگ کم ہوتے ہیں جن کے ''ذاتی مقاصد'' کی تکمیل دوسروں کے سرمائے سے ہو جائے۔ ہماری نظر میں کوئی ادارہ اس investment کے لیے آمادہ نہیں۔ شاید اس لیے کہ ہم میں اس کاروبار کو چلانے کی صلاحیت نہیں۔ انویسٹمنٹ کے لغوی معنی ہیں سرمایہ لگانا، محاصرہ کرنا۔ پہلے معنی تو ہماری سمجھ میں آتے ہیں جو investment کرتے ہوں، باقر نقوی نے بھی کبھی اس لفظ کے دوسرے معنی پر روشنی نہیں ڈالی، حالانکہ خود پیشے کے اعتبار سے ایک انشورنس کمپنی (انشورنس کے جدید اصطلاحی معنی کی رُو سے

investment کمپنی) میں ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ انشورنس کے معنی ہیں تحفظ، موت کے مقابل زندگی کے تحفظات فراہم کرنا، ضرر رساں قوتوں کے خلاف انسانی جان و مال اور حقوق کی حفاظت کرنا۔ اسی لیے زندگی کے نشیب و فراز، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے امراض، خطرات اور تحفظات پر انشورنس والوں کی گہری نظر ہوتی ہے۔ زندگی کے روزمرہ عوامل اور انسانوں کے رویوں سے اُن کا قریبی رشتہ استوار ہوتا ہے۔ باقر نے ایک دیانت دار انسان کی حیثیت سے اپنے فرائضِ منصبی کو اپنی عادت بنا لیا ہے۔ شاید اسی لیے ان کی شاعری میں بھی زندگی کی اقدار پوری طرح واضح ہیں اور زندگی کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی سے اُن کا رشتہ مسلسل ہے۔ مشاہدات، تجربات، روزمرہ کے مسائل، زندگی اور زندہ انسانوں کی کش مکشِ حیات سے وابستگی اُن کا مزاج بن گیا ہے۔ شاعر کا مزاج اُس کی شاعری پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کا کلام اس کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بشرطے کہ سچائی سے اُس کی وابستگی ہو۔ باقر کے معاملے میں اسی سچائی، کا نام باقر نقوی ہے۔

کلاہِ کذب و قبائے ریا سے بہتر ہے
کہ آدمی کے بدن پر کوئی لباس نہ ہو

باقر خوابوں کے جزیروں میں بھٹکنے والا انسان نہیں بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کی کٹھن وادیوں سے گزرنے والا ایسا فن کار ہے جس کی انگلیاں وقت کی نبض پر ہیں اور ذہن سماجی برائیوں کی جستجو میں۔ باقر کو ''کلاہِ کذب'' اور ''قبائے ریا'' سے نفرت ہے اسی لیے باقر کے کلام میں کہیں ریاکاری، مصلحت اندیشی، خود پرستی اور جھوٹی نمائش نظر نہیں آتی۔ اُس کی گفتار و کردار یکساں ہیں، اُس کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے افسران کی قصیدہ گوئی اور خوشامد میں رطب اللسان رہنے کے ساتھ یہ اعلان نہیں کرتا کہ اُسے قصیدہ گوئی سے نفرت ہے، نہ وہ قصیدہ گوئی کرتا ہے اور نہ ہی قصیدہ گوئی کی بے محل مذمت کر کے اپنے احساسِ کم تری کو چھپانے کی اُسے ضرورت ہے۔ خوشامد وہ کرتے ہیں جو غیر محفوظ ہوتے ہیں، جن کے کردار میں دوغلا پن ہوتا ہے۔ باقر کے جسم پر دو چہرے نہیں ہیں، قبائے ریا سے نفرت کرنے والے باقر نے جو محسوس کیا، وہی کہا۔ جو

سوچا وہی لکھا۔ یہی سچائی فن کی آبرو ہے، یہی صداقت فن کار کی پہچان ہوتی ہے اور باقر اس دولت سے مالا مال ہے۔

باقر کا نام کسی سجی ہوئی اردو دکان کے خریداروں کی فہرست میں درج نہیں ہے نہ ہی کسی مکتبِ فکر کے باقاعدہ اراکین کے رجسٹر میں باقر کے نام کا اندراج ہے۔ لیکن اُس کی سچائی زندگی سے قریبی رشتہ، انسانی دکھوں پر تڑپ جانے کا جذبہ باقر کی فکر کا آئینہ دار ہے۔ روشن خیالی اور ترقی پسندی باقر کا مؤقف ہیں اور جنگ سے نفرت اور امن سے محبت مطمعِ نظر۔ شکست خوردہ ذہن اور خود اپنے غیر محفوظ اور بے مستقبل مؤقف کے ہاتھوں لہولہان لوگ ہمیں کچھ بھی کہیں مگر ہم ترقی پسند وہی کچھ تو کہتے ہیں جو باقر کہہ رہے ہیں:

انسانیت کے غم میں جو ٹپکا تھا ایک اشک
وہ وسعتوں میں مثلِ سمندر لگا مجھے

یا یوں کہوں جو کچھ باقر کہہ رہے ہیں وہی تو ترقی پسندی ہے۔ ترقی پسند فکر سے باقر نقوی کی ہم آہنگی دیکھیے، ''اسٹاروار'' اور ''نیوکلائی جنگ'' کے خطرات کا باقر نے کس جرأت اور کس خوب صورتی سے اعلان کیا ہے:

پہنچ گئے ہیں صنم، نور کے جہانوں میں
زمیں کی جنگ چھڑے گی اب آسمانوں میں
اُفق پہ جھومیں گے ہر وقت ایٹمی بادل
چمن میں راکھ تو آسیب آشیانوں میں
اُگے نہ موت زمیں پر تو اور کیا ہوگا
کہ بیج زہر کے بانٹے گئے کسانوں میں
دودھ کی نہریں سوکھ گئی ہیں، پتھر ہے مخلوق
جنگل میں نیزے اُگتے ہیں، ندیوں میں تیزاب

ریاکاری کی ہوش رُبا اور سجی ہوئی دکانوں کی حقیقت سے باقر پوری طرح باخبر ہیں۔

یہ زینتیں بھی عجب ہیں یہ سادگی بھی عجیب
ریا کے سارے ہنر جسم پر سجا رکھنا
نہ جانے کون سا کس وقت کام آ جائے
سو ایک جیب میں بت ایک میں خدا رکھنا

نمود و نام کے معیار سیم و زر ہوں جہاں
وہاں بلندیِ شہرت پہ کم نصب دیکھیے

گھر سے بے گھر ہونے کا احساس باقر کو بھی بڑی شدت کے ساتھ ہے لیکن یہاں بھی اُن کی سچائی اور حقیقت نگری نے اُن کا ساتھ دیا ہے۔ میں ان منزلوں میں باقر کا ہم نوا بھی ہوں اور مداح بھی۔ عام طور پر لوگ ترکِ وطن کو ہجرت کا نام دے کر کسبِ معاش اور حصولِ زر کی جدوجہد کو ان بااصول عظیم لوگوں کی عظمتوں کے قافلے میں شامل کرنے کی گستاخی کرتے ہیں جنھوں نے اصولوں کے لیے ہجرت کی یا ''غربت'' کو اپنایا۔ میں نے ایک شعر کہا تو باقر کو بہت پسند آیا اس لیے کہ اس فکر میں ہم ساتھ ساتھ ہیں:

تلاشِ رزق میں ترکِ وطن ہے دربدری
اگر اصول ہوں پیشِ نظر تو ہجرت ہے

باقر نے بے گھری کی اس کیفیت کو ہجرت کا لباس نہیں پہنایا بلکہ اُس دکھ میں وقار کے ساتھ صورتِ حال سے دوچار ہونے کا حوصلہ پیدا کیا ہے:

دُور اک جزیرے پر کر لیا ہے گھر اپنا
اب یہی وطن اپنا، اب یہی نگر اپنا

کوئی پوچھے جو کبھی گھر، تو اسے گھر کہہ لیں
اور ہم ان در و دیوار سے کیا مانگتے ہیں

اجنبی ہے سرزمیں تُو تو اجنبی نہ رہ
کوئی نقش اُتار دے، کوئی استعارہ لے

کیا کریں واپس وطن جا کر جہاں گھر ہے نہ در
اب مرے اجداد کے مدفن بھی ٹیلے ہو گئے

کیسے کیسے بھیس میں لائی ہے عریانی مجھے
تشنگی کے نیش سے ڈستا رہا پانی مجھے

محترم عقیل رضوی کے تبصرے کے بعد باقر کے کلام پر نقد و نظر میری ذات کے حوالے سے سوئے ادب بھی ہے اور لاحاصل بھی، لہٰذا میں وہ سب کچھ نہیں کہنا چاہتا جو کہہ سکتا ہوں۔ باقر کے دوست کی حیثیت سے میں نے اُن تمام کیفیات کو دیکھا ہے جس سے باقر دوچار ہوئے ہیں۔ میں اس سارے پس منظر سے نہ صرف آگاہ ہوں بلکہ مجھے بھرپور اندازہ ہے کہ باقر شعرگوئی کی کن کن منزلوں سے گزرے ہیں اور وہ کتنی تیزی سے شعوری سفر طے کر رہے ہیں۔ میں نے باقر کی بہت سی تازہ غزلیں "تازہ ہوا" میں شامل نہیں کیں بلکہ صرف ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۵ء تک کا کلام شریکِ اشاعت کیا ہے تاکہ اہلِ نظر باقر کے فنی ارتقا کو دیکھ سکیں۔ ۸۶ء سے ۸۸ء تک کا کام دوسرے مجموعے میں شامل ہوگا تو باقر کے سفر کی سمت کا تعین اور اُن کی منزل کا نشان زیادہ واضح ہوگا اور میں نے جس سمت کی نشان دہی کی ہے وہ ثبوت کی منزلوں تک پہنچ سکے گی۔

اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے ساتھ میں ایک عرصے سے کوشاں ہوں کہ مغربی دنیا میں جہاں P.R کے ڈھول تاشے اس زور سے بج رہے ہیں کہ سچی اور سادہ آواز سنائی نہیں دیتی اور ہر شخص اپنے projection میں مصروف ہے وہاں ایسے تمام اہلِ قلم کو تلاش کر کے اس بات پر آمادہ کروں کہ وہ گوشہ نشینی، لاپروائی، تساہل یا بے نیازی کے حصار سے باہر نکلیں اور مجھے یہ موقع دیں اور یہ عزت بخشیں کہ میں اُن کی نگارشات

اردو کے قارئین تک پہنچا سکوں۔ میری رائے میں تخلیق کار کی ہر تحقیق اس دور کے قارئین یا ناظرین کی امانت ہوتی ہے۔ لہٰذا میں مغرب میں اردو زبان اور اردو ادب کی ساری امانتیں اردو والوں تک پہنچانے کا اہم تر فریضہ، نشر و اشاعت کے ذریعے ادا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں، ''لہو کا خراج''، ''حقیقت شاعری''، ''لبِ سحر'' اور ''ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر'' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ باقر نقوی کے کلام کی اشاعت کا سارا بار محترم عقیل رضوی صاحب نے اُٹھا لیا تھا جس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں۔ دوستی کے رشتے سے میں نے باقر کے متعلق رائے ضرور دی ہے اور میں جو کچھ سمجھا ہوں اُس سمت کی نشان دہی بھی کی ہے۔ لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے، جہاں تک باقر کے کلام پر تنقید کا سوال ہے تو اس کا حق اہل الرائے حضرات کو ہے۔ میں تو صرف اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ بقول برادر گرامی جناب محشر بدایونی:

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

(لندن ۱۵اپریل ۱۹۸۸ء)

ترا نور میری نگاہ ہے، ترا علم میرا شعور ہے
میں گناہ گار کبھی ہوا تو مری انا کا قصور ہے

کوئی اہلِ علم و نگاہ ہو تو کتابِ کون و مکاں پڑھے
ترا لفظ لفظ میں عکس ہے، ترا ذکر بینِ سطور ہے

ترا عزم ہو، ترا حسن ہو، ترا اعتبارِ کلام ہو
کبھی دشت جوئے فرات ہے، کبھی چاہ ہے، کبھی طور ہے

ترا شہر اور مرے قدم یہ شرف نہیں ہے تو اور کیا
یہ گناہ گار، یہ بے نوا، یہ حقیر تیرے حضور ہے

وقت عجب عجب طرح امتحاں ہمارا لے
رات کی سیاہی دے، صبح کا ستارا لے

خشک خشک صورتیں، خام خام مورتیں
کون اس جہان میں زندگی دوبارا لے

اجنبی ہے سرزمیں، تُو تو اجنبی نہ رہ
کوئی نقش اُتار دے، کوئی استعارا لے

بہہ گیا تو جائے گا پانیوں کے غار میں
کوئی شاخ تھام لے، کوئی تو کنارا لے

چشمِ نقش کار میں التزامِ رنگ کر
صبح کو حصار کر شام سے نظارا کر

(نذرِ غالب)

ہوں رہ نوردِ شوق مگر پا بُریدہ ہوں
میں ہجوِ کائنات بہ طرزِ قصیدہ ہوں

شرمندۂ سلوکِ مسیحا نہ کر مجھے
زخمیِ تیغِ دوست ہوں، مردم گزیدہ ہوں

مت کر ہوا جو اور تماشائے روزگار
میں وہ نوشتۂ ورقِ آب دیدہ ہوں

تن سے جدا ہے پھر بھی قلم ہے گرفت میں
گویا کسی شہید کا دستِ بریدہ ہوں

کلماتِ حق رہے ہیں رہینِ زباں مرے
گویا مزاجِ وقت کا وصفِ حمیدہ ہوں

تو عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ تھا
میں عندلیبِ گلشنِ آتش گزیدہ ہوں

رات گئے تک بھور اُجالا ہم نے دیکھا
پیاس کے ہاتھ میں خالی پیالا ہم نے دیکھا

معبد کی دیوار کے نیچے ساری زینت
منبر پر مکڑی کا جالا ہم نے دیکھا

بازاروں میں سنگ جراحت کے بت دیکھے
ہر گھر میں لیکن اک بھالا ہم نے دیکھا

یہ بھی اُس کی شطرنجی چالیں ہی ہوں گی
اُجلے گھر میں مہرہ کالا ہم نے دیکھا

رات گئے پھرتیں آوارہ دوشیزائیں
جنگل کا یہ رُوپ نرالا ہم نے دیکھا

جس کا ہر کردار برہنہ رقصاں رقصاں
ایسا بھی اک روز رسالا ہم نے دیکھا

فرازِ عدل پہ حکام بے ادب دیکھے
گناہ گار عجب، فیصلے عجب دیکھے

نمود و نام کے معیار سیم و زر ہوں جہاں
وہاں بلندیِ شہرت پہ کم نسب دیکھے

قبا میں آگ لگا لی ہے روشنی کے لیے
ہماری شان تو پروردگارِ شب دیکھے

اُداس چہروں کا سیلاب ہر طرف ہے رواں
گزر گئے ہیں زمانے شگفتہ لب دیکھے

سوادِ شام میں گم ہو گئے چراغِ اُمید
نگاہِ وقت نے کیا حادثے غضب دیکھے

وہ روشنی کا جھماکا گزر گیا لیکن
کہاں نگاہ جو نقش و نگارِ شب دیکھے

اگر ہمیں اسی مرکز پہ لوٹ آنا تھا
تو سارے خواب بھی کیا ہم نے بے سبب دیکھے

یہ کیسا شہر ہے کہ جو آباد ہے مگر
دیکھو بلندیوں سے تو صحرا دکھائی دے

جاری ہو نغمۂ حیات تارِ رباب کچھ تو بول
کب سے ہے منتظر بہار میرے گلاب کچھ تو بول

رنگوں کے رنگ اُڑ گئے سہمی ہوئی ہیں تتلیاں
محرمِ آب و گل نکل، جانِ تراب کچھ تو بول

جسم پہ لگ رہے ہیں زخم نیزۂ اعتبار کے
اے مرے ہوش کچھ تو کہہ، اے مرے خواب کچھ تو بول

کتنے سمندروں کا خوں پی گئی بے حسی کی ریت
عظمتِ خاک اب تو اُٹھ، عہدِ سراب کچھ تو بول

شاخِ بدن پہ رکھ دیے چیل نے اپنے گھونسلے
عزلتِ ضعف سانس لے، تابِ شباب کچھ تو بول

تیرے لہو کی سرخیاں زیبِ قبائے شہریار
ترک بھی کر قناعتِ روزِ حساب، کچھ تو بول

حرمتِ حرف کیا ہوئی، لفظ ہیں کیوں سکوت میں
ایسا بھی کیا کہ چپ رہیں مثلِ کتاب کچھ تو بول

خواب کی بستی کو سجتا ہے سنہرا راستہ
کچے گھر کے واسطے کافی ہے کچا راستہ

عذابِ ہجر دینے والے وصل کا گماں بھی دے
قبول دھوپ ہے مگر فریبِ سائباں بھی دے

نہ جانے کب سے ہم پہ قرض ہے جنوں کی داستاں
سلیقۂ بیاں دیا تو اب ہمیں زباں بھی دے

یہ کیا کہ اک اڑان ہی میں کٹ گئیں مسافتیں
عطا کیے ہیں بال و پر تو ہم کو آسماں بھی دے

ہے لفظ لفظ خونچکاں تو اشک اشک حسرتیں
امینِ فکر و فن کیا تو جبر سے اماں بھی دے

لگاؤ دوستو دلوں میں کربِ آگہی کی آگ
جو گرم جسم کو رکھے کبھی کبھی دھواں بھی دے

پھول ہم نے کبھی مانگے، نہ صبا مانگتے ہیں
ہم تو جینے کے لیے تازہ ہوا مانگتے ہیں

تو خدا ہے تو ہماری بھی انا ہے کوئی
حق سمجھتے ہیں جو ہم تجھ سے دعا مانگتے ہیں

ہم نے کب گوہر و مرجاں کے خزانے چاہے
ہم تو بس ایک محبت کی فضا مانگتے ہیں

کوئی حاجت نہیں رکھتے ہیں بجز تابِ کلام
مسندِ طور، نہ جلوہ نہ عصا مانگتے ہیں

کوئی پوچھے جو کبھی گھر تو اسے گھر کہہ لیں
اور ہم ان در و دیوار سے کیا مانگتے ہیں

کتنے بھولے ہیں ترے شہر کے زخمی پیکر
جو مسیحاؤں کے قاتل سے دوا مانگتے ہیں

سبک سری میں بھی اندیشۂ ہوا رکھنا
سلگ اُٹھے ہو تو جلنے کا حوصلہ رکھنا

نئی فضا میں نئے پر نکالنے ہوں گے
فلک کو زیر، زمیں کو گریز پا رکھنا

تمھارے جسم کے صندل کی آبرو ہے بہت
ہجومِ شوق میں رہ کر بھی فاصلہ رکھنا

زمین پھول، فضا نور، آسمان دھنک
انھیں میں رہنا مگر، رنگ بھی جدا رکھنا

تمھارے شہر کے لب بستہ شاعروں میں سے ہوں
مرے لیے بھی کوئی حرفِ بے نوا رکھنا

ق

یہ زینتیں بھی عجب ہیں یہ سادگی بھی عجب
ریا کے سارے ہنر جسم پر سجا رکھنا

نہ جانے کون سا کس وقت کام آ جائے
سو ایک جیب میں بت ایک میں خدا رکھنا

کلاہِ کذب و قبائے ریا سے بہتر ہے
کہ آدمی کے بدن پر کوئی لباس نہ ہو

سلگتی آنکھوں میں تحریکِ خواب کر جانا
پھر اس کے بعد جہاں چاہو عمر بھر جانا

بجھا بجھا تھا مگر کتنا آتشیں نکلا
وہ خشک پیڑ جسے ہم نے بے ثمر جانا

ہمارے قلب میں نیزے کا پھل اُتار گیا
وہ مہربان! ہمیشہ جسے سِپر جانا

دلوں میں گھول گیا ہے سیاہیاں کیسی
وہ چاند چہرہ! جسے ہم نے معتبر جانا

خزاں کا شکر! کہ بہتوں کا اصل رُوپ کھلا
ببول تھا وہ! جسے مہرباں شجر جانا

گلوں نے کیا یہ اسی خوش بدن سے سیکھا ہے
یہ انگ انگ مہکنا بکھر بکھر جانا

نام سے میرے کبھی مجھ کو پکارا جائے
میں جدھر جاؤں اُدھر میرا ستارا جائے

رنگ بے چین ہیں ہاتھوں میں مچلتے ہیں قلم
کورے کاغذ پہ کوئی نقش اُتارا جائے

کشتیاں ڈوب چکیں ریت کے دریاؤں میں
اب تو سیلاب کے ہمراہ کنارا جائے

یہ جو پھرتے ہیں بہت طرۂ و دستار لیے
جادۂ صبر سے ان کو بھی گزارا جائے

ہے بپا پھر وہی جشنِ مہِ نخشب باقرؔ
ایک جگنو ہے کہیں وہ بھی نہ مارا جائے

پہنچ گئے ہیں صنم نور کے جہانوں میں
زمیں کی جنگ چھڑے گی اب آسمانوں میں

ہوس کے دیو سمندر میں زہر گھولیں گے
ہوائیں آگ لگائیں گی بادبانوں میں

اُفق پہ جھومیں گے ہر وقت جوہری بادل
چمن میں راکھ تو آسیب آشیانوں میں

سوادِ جہل کے زنداں میں قید ہوگا خدا
بنائے جائیں گے انسان کارخانوں میں

اُگے نہ موت زمیں پر تو اور کیا ہوگا
کہ بیج زہر کے بانٹے گئے کسانوں میں

یوں ہی رات گزر جائے گی، گل ڈھناں کچھ بات کرو
خواب کی سیج بکھر جائے گی گل ڈھناں کچھ بات کرو

چپ کی شام کے جاتے جاتے چاند بھی کجلا جائے گا
وقت کی راکھ بکھر جائے گی گل ڈھناں کچھ بات کرو

سناٹے کی خشک ہوا میں کلیوں کے منھ سوکھ گئے
چپ چپ بلبل مر جائے گی گل ڈھناں کچھ بات کرو

پھول جھڑیں، کچھ موتی بکھریں، خوشبو کے بادل برسیں
پھیکی صبح نکھر جائے، گی گل ڈھناں کچھ بات کرو

خاموشی کی برف میں کیسے رُت کی کونپل پھوٹے گی
رنگ کی دیوی مر جائے گی گل ڈھناں کچھ بات کرو

maablib.org

جنگل گائے، دریا ناچے، ریت ہنسے پتھر بولے
دنیا آپ سنور جائے گی گل ڈھناں کچھ بات کرو

حکمراں جب سے خداؤں کے قبیلے ہو گئے
سرخ دریا ہو گئے انسان پیلے ہو گئے

سارے موسم جا چکے اے مہرباں تو ہے کہاں
اب تو شاخوں پر لگے پھل بھی رسیلے ہو گئے

ہے بس اتنا سا گرفتاروں کا احساسِ نشاط
آئی کچھ تازہ ہوا کچھ بند ڈھیلے ہو گئے

وقت کی گردش نے ہم کو کر دیا جب ننگے پاؤں
راستوں کے سنگ ریزے بھی نکیلے ہو گئے

کیا کریں واپس وطن جا کر جہاں گھر ہے نہ در
اب مرے اجداد کے مدفن بھی ٹیلے ہو گئے

دل نے سودا کر لیا ہے فکرِ عالم گیر کا
رنگ پھیکا پڑ گیا جب سے تری تصویر کا

نامکمل بستیاں رہتی ہیں زنداں کے بغیر
یہ بھی اک پہلو ہے تیرے جذبۂ تعمیر کا

حلقہ در حلقہ اخوت کی علامت ہے مگر
نام دیوانوں نے رسوا کر دیا زنجیر کا

آفرینش سے تصادم میں ہیں کم زور و قوی
ورنہ سچ پوچھو تو کیا رشتہ ہے دل سے تیر کا

ہم سے ہی قائم رہے دار و رسن کے سلسلے
ہم نے کب مانا ہے کوئی فیصلہ تقدیر کا

کھل رہے ہوں پھول جیسے بج رہا ہو جلترنگ
ہم نے وہ عالم بھی دیکھا ہے تری تقریر کا

تیرے شہر کا دریا گہرا کتنا ہے
لہر لہر پر پھر بھی پہرا کتنا ہے

اندر جا کر دیکھو تو سب پتھر کے
پر مندر کا کلس سنہرا کتنا ہے

اٹھارہ گھنٹے سے سورج شہر میں ہے
لیکن میرے گھر میں ٹھہرا کتنا ہے

غازے کا ملبوس کہاں تک کام آئے
تیری جلد کا رنگ بھی گہرا کتنا ہے

اُفق اُفق تک تیری حکومت ہے لیکن
اس میں بستی کتنی، صحرا کتنا ہے

آنکھوں کے پردے پر ہے رنگوں کا سایہ کیا
خوشبو کی دیوی نے پھر آنچل لہرا کیا

سورج سے یاری کر لی ہے جلتے جسموں نے
بادل کس کے کام آئے گا، ہوگا سایہ کیا

ندی کنارے ریت کے نیچے پانی ہی پانی
تپتے بن کی ریت بتا تیرا سرمایہ کیا

وحشت میں ہم بھی جاگے ہیں ساری ساری رات
اتنی رات گئے تک کرتا ہے ہمسایہ کیا

آنکھ کھلی تو وہی پرانا بستر تھا اور ہم
خواب سہانے دیکھ لیے پر خواب سے پایا کیا

ہاں کہہ دو کہ اب کوئی بھی پیاسا نہ رہے گا
پیاسی رہی مٹی تو یہ دریا نہ رہے گا
اب کے نظر آتے ہیں عجب پیاسوں کے تیور
پانی نہ ملے گا تو پیالا نہ رہے گا
چھڑکا ہے عجب زہر فضا میں کہ ابد تک
لگتا ہے کسی پیڑ پہ پتا نہ رہے گا
بے کار زمینوں کو نگل جاتے ہیں جنگل
روکو گے مسافر کو تو رستہ نہ رہے گا
ملتے ہیں کئی رنگ تبھی بنتا ہے منظر
اک رنگ میں کچھ لطفِ نظارا نہ رہے گا
درد اپنا کوئی مجھ کو کبھی سونپ کے دیکھو
اپناؤں گا ایسا کہ تمھارا نہ رہے گا
ہم پھول اُگانے پہ اُتر آئے تو اک دن
اس روئے زمیں پر کوئی صحرا نہ رہے گا
گر کھوئے رہیں گے یونہی نیرنگِ سفر میں
گھر ہو کے بھی گھر بار ہمارا نہ رہے گا

اس شب کے اندھیرے کا تصور تو کرو جب
یہ چاند نہ ہوگا یہ ستارا نہ رہے گا

برسے کھیت میں سونا بن کے، مہکے کیاری کیاری دھوپ
جنگل جنگل گلشن گلشن خوب کرے گل کاری دھوپ

برکھا رُت میں دن بھر کھیلے آنکھ مچولی بادل سے
ٹھنڈی رُت میں ہلکی ہلکی، گرمی ہو تو بھاری دھوپ

پیار کے کارن حدِ نظر تک رنگ برنگے پھول کھلیں
سارے بدن پر پھیلے جیسے کومل کومل پیاری دھوپ

سمے کی اندھی چال میں آ کر گہن لگا ہے سورج کو
قسمت کا اندھیر ہے ورنہ سائے سے کب ہاری دھوپ

پیارے سورج دیوتا نے کیا جانے کیوں منھ موڑ لیا
جاتے جاتے کانپ رہی تھی چھنی پر بے چاری دھوپ

آس کے دیپ جلا کر باقرؔ رات گزاریں گے ہم لوگ
جاتے سورج سے کہہ دو ہے اس کی ذمہ داری دھوپ

پیدا ہو لبِ گنگ سے کچھ بات کی صورت
خود حرف نکل آئیں گے بارات کی صورت

اُٹھو تو! لیے تیشۂ مہتابِ تمنا
چاہو تو بدل جائے گی ظلمات کی صورت

چہرے پہ دھنک ہے نہ پلک پر کوئی جگنو
یہ ریت کا صحرا ہے کہ برسات کی صورت

الفاظ ڈراتے رہے آسیب کی مانند
بدلی نہ مگر ہم نے خیالات کی صورت

خوش رنگ بہاروں کی دعا مانگ رہے ہیں
بے برگ شجر، اُٹھے ہوئے ہات کی صورت

اب ان سے کوئی رسم و تعلق بھی نہیں ہے
اب روز نکلتی ہے ملاقات کی صورت

جیسی نگری ویسا ڈھنگ　　کچا دھاگا کچا رنگ
ٹھنڈے سائے میں مت بیٹھ　　بہہ تپتی کرنوں کے سنگ
ناچ اُٹھے دنیا گر ہو　　تیرا سُر میرا آہنگ
دیکھیں کچے کچے خواب　　دو خوابیدہ ایک پلنگ
ہونٹ تبسم پر مجبور　　جسم کے اندر جاری جنگ
ہاتھ میں سونے کی زنجیر　　کون اُٹھائے تیشہ و سنگ
دید کے قابل ہوتے ہیں　　پت جھڑ میں پتوں کے رنگ

کھل! اے پیراہن کی دھنک
لہرا! اے خوشبو کی اُمنگ

روز چنتا ہوں ان کی یاد کے پھول
یہ فریضہ کبھی قضا نہ ہوا

جھانکا صدف صدف کوئی گوہر نہیں ملا
نابینا آئنے ملے جوہر نہیں ملا

پیراک شیر و شہد کی نہروں میں تھے مگن
پُرشور پانیوں کو شناور نہیں ملا

لہروں کی طرح بڑھتے رہے آدمی تمام
لیکن کسی بدن پہ کوئی سر نہیں ملا

سب رنگ موسموں کے بھنور میں بچھڑ گئے
مٹی کو خوشبوؤں کا پیمبر نہیں ملا

پیوست تیر آنکھ میں ہیں انتظار کے
دنیا گزر گئی کوئی رہبر نہیں ملا

جس کے لہو میں زہرِ خود آرائی بھی نہ ہو
ایسا ابھی تلک تو سخن ور نہیں ملا

زمانہ ہوگیا، موسم بدل گئے ہوں گے
مرے لگائے ہوئے پیڑ پھل گئے ہوں گے

سنا ہے اب کے برس برف گر رہی ہے بہت
تو میرے باغ کے سب پھول جل گئے ہوں گے

چڑھی تھی اب کے ندی گرمیوں کے موسم میں
ضرور برف کے تودے پگھل گئے ہوں گے

وہی ہے کھیل، اداکار بھی وہی سارے
سماں ہے اور تو پردے بدل گئے ہوں گے

بجھے گی پیاس تو کیا آبِ گرم سے باقرؔ
پرندے پیٹ کے موتی اُگل گئے ہوں گے

زندگی مجموعۂ افکار ہے باقر میاں
ہر طرف دیوار ہی دیوار ہے باقر میاں

کب تلک سمٹے رہو گے خود میں سیپی کی طرح
اس طرح جینا بہت دشوار ہے باقر میاں

آپ جس قابل ہیں اتنی قدر کیوں ہوتی نہیں
سارا فتنہ آپ کا پندار ہے باقر میاں

ساری دنیا آپ کے نزدیک دیوانی ہوئی
آپ ہی کا ذہن خود بیمار ہے باقر میاں

لے نہ ڈوبے آپ کو اک دن شریفانہ مزاج
آج کی دنیا بہت عیار ہے باقر میاں

مرحبا! طے ہوگیا نطق و بیاں کا مرحلہ
اس کے آگے امتحانِ دار ہے باقر میاں

جاہلوں کا زور ہے دانش وروں کے بھیس میں
آپ کی دانش سے کب انکار ہے باقر میاں

آپ کی صحبت میں کیسے ہوگا پریوں کا گزر
آپ کی تو سانس بھی تلوار ہے باقر میاں

کچھ انوکھی بات کہیے، گفتگو کیجے نئی
ورنہ ساری شاعری بے کار ہے باقر میاں

چشمِ بدنصیب تیرے خواب کیا ہوئے
جسم! تیرے درد کے گلاب کیا ہوئے

راستوں سے پھر اُلجھ پڑیں سیاہیاں
اے جبین تیرے ماہتاب کیا ہوئے

خشک لب کی اور تشنگی کی آبرو
آئنے بکدھر گئے سراب کیا ہوئے

جنگلوں کے راستے کہاں بھٹک گئے
اے فصیلِ شہر تیرے باب کیا ہوئے

رنگ و نور سے بجی دھنک کدھر گئی
موتیوں بھرے ہوئے سحاب کیا ہوئے

بکل آنکھوں نے دکھلائے کیسے کیسے خواب
نیلے بادل سرخ ستارے نارنجی ماہتاب

سورج کے پیالے سے نکلے عجب سنہری نہر
کبھی زمیں کا رُوپ جلائے کبھی کرے شاداب

دودھ کی نہریں سوکھ گئی ہیں پتھر ہے مخلوق
جنگل میں نیزے اُگتے ہیں، ندیوں میں تیزاب

کنکر لے کر سرخ پرندے آئے غول کے غول
مینارے گرنے والے ہیں ہلتی ہے محراب

اب بھی کتنا تازہ ہے میرے گل دان کا پھول
میرے گھر سے ہر دم نکلے خوشبو کا سیلاب

ایک پل کو مرے حجرے میں ٹھہر جائے کوئی
خالی آنکھوں کو نئے خواب سے بھر جائے کوئی

روگ بن کر مجھے ڈسنے لگا تنہائی کا سکھ
خوف بن کر ہی سہی دل میں اُتر جائے کوئی

آئیں اس سمت بھی چاہت کے سنہرے بادل
پھول بن کر مرے صحرا میں بکھر جائے کوئی

ایک مدت سے مری آس کا دامن ہے اُداس
ٹوٹ کر ہار کی مانند بکھر جائے کوئی

میں تو بس اپنی محبت کا صلہ مانگتا ہوں
میں نے کب چاہا کہ میرے لیے مر جائے کوئی

ستونِ خوف کب نہ تھا، بلند دار کب نہ تھا
چہار سمت نفرتوں کا سنگ زار کب نہ تھا

کمال پانیوں کا تھا کہ راستے بنا لیے
ندی کی راہ میں مہیب کوہسار کب نہ تھا

تمام عمر چاہتے رہے فریبِ کہکشاں
تمھیں خود اپنے دست و پا پہ اختیار کب نہ تھا

تمھی تو جا کے بس گئے ہو پتھروں کے دیس میں
یہ سبز جھیل کب نہ تھی، یہ آبشار کب نہ تھا

یہ اور بات ہے کہ سب پیادہ پا چلے گئے
ہمارے قافلے میں ورنہ شہسوار کب نہ تھا

چلے تو جلترنگ سا، ہنسے تو جیسے بانسری
یہ کون ہے کہ جس کا ہم کو انتظار کب نہ تھا

جو تلخ تر ہو میں اس زہر کی تلاش میں ہوں
نہ جانے کیوں میں کسی قہر کی تلاش میں ہوں

جو میری سوکھتی کھیتی کو دے سکے پانی
میں مدتوں سے اس اک نہر کی تلاش میں ہوں

جو ڈوبتوں کو اچانک اُبھار دیتی ہے
نہ جانے کب سے اسی لہر کی تلاش میں ہوں

چکھا سکے کبھی سائے کو روشنی کا مزہ
میں شب نصیب اس اک مہر کی تلاش میں ہوں

جہاں سکون سے اک رات سو سکے کوئی
میں ایک عمر سے اس شہر کی تلاش میں ہوں

جس کو اپنی مٹی کی پہچان نہیں
جانوروں سے بدتر ہے، انسان نہیں

خوشبو کے اور خوابوں کے متوالے ہم
اپنے پاس تو شمشیر و پیکان نہیں

پیڑ پہ بیٹھی اک معصوم گلہری کا
خون بہانا ساونتوں کی شان نہیں

ہم کو اکثر وہ گھر بھی یاد آتا ہے
جس میں اک پل بھی جینا آسان نہیں

بنتی سن کر خاموشی کا جرم کریں
ہم دل والے پتھر کے بھگوان نہیں

روشنیوں کے دریا میں رنگوں کے پیکر ڈوب گئے
اک دھنک اُبھری تو باقی سارے منظر ڈوب گئے

بادل کی خواہش کیسی اور پانی کا ماتم کیسا
پیاسے صحراؤں میں نہ جانے کتنے سمندر ڈوب گئے

کوئی شفق پھولی نہ اُفق پر اور نہ کوئی لہر اُٹھی
جسموں کے تالاب میں سب چمکیلے خنجر ڈوب گئے

سرکش تیروں، بیکل تلواروں کی ضرورت جن کو تھی
بے ترتیب سرابوں میں وہ سارے سکندر ڈوب گئے

باقر جی خوش قسمت ہو تم کوہِ نور پر بیٹھے ہو
چپ کی کالی جھیل میں دیکھو کتنے سخن ور ڈوب گئے

خاموشی سے غم سہنے کا کیسا اجر ملا ہے
میرے جسم کے صحرا میں اک درد کا پھول کھلا ہے

اک ویران جزیرہ جس تک کشتی اور نہ پل
اندر اندر دُکھ کا صحرا چاروں طرف دریا ہے

تو نے خوابوں کی وادی میں سارے پھول اُگائے
ساری عمر اب خواب ہی دیکھ کہ تیری یہی سزا ہے

کس کو چاہوں کس سے بولوں خول سے کیسے نکلوں
گھر کے اندر چپ کا جادو باہر تیز ہوا ہے

حرف کو اپنی مصلحتوں پر کیسے قرباں کر دوں
حرف اور صوت کی خاطر اب تک کتنا خون بہا ہے

کھلی کتاب سا ارض و سما کے سامنے تھا
بدن تھا کاغذی لیکن ہوا کے سامنے تھا

وہ جس نے ہنس کے بسر کی ہے زندگی اپنی
تمام عمر نہتا قضا کے سامنے تھا

ذرا سی عمر میں جھیلیں قیامتیں کیا کیا
میں ابتدا تھا مگر انتہا کے سامنے تھا

وفورِ خوف کی لذت سے کانپتا تھا بدن
میں سرخ رو تھا جب اپنے خدا کے سامنے تھا

maablib.org

تذکرہ چشم و لب و گیسو کا بازاروں میں ہے
آج کل دل توڑنے والا بھی فن کاروں میں ہے

ہیں نظامِ امن کی اب بھی وہی نیرنگیاں
کیا خبر کس کس کا مدفن اُٹھتی دیواروں میں ہے

میں وہ انساں ہوں بدل سکتا ہے جو تاروں کی چال
وہ مری قسمت نہیں جو ٹوٹتے تاروں میں ہے

اس بہاروں کی زمیں سے آدمی گھبرا گیا
یاالٰہی کیا کشش ویران سیاروں میں ہے

برف تھوڑی دیر رکھتا ہوں تو جل اُٹھتے ہیں ہاتھ
دیکھنا یہ ہے کہ ٹھنڈک کتنی انگاروں میں ہے

دیوار و در کدھر گئے صحرا کہاں گیا
ہم جس میں بہہ رہے ہیں وہ دریا کہاں گیا

آنکھوں میں خوں کا رنگ بھی اب پھیلتا نہیں
منظر کدھر چلے گئے، جادا کہاں گیا

چاروں طرف تھی برف مگر دل میں آگ تھی
آنکھوں کا گرم گرم وہ چشما کہاں گیا

دیوار نقش ہے روزن ہیں نور نور
ہم جس میں بس رہے تھے وہ صحرا کہاں گیا

اک آشیاں اُداس ہے سُونا ہے اک قفس
شامیں پکارتی ہیں پرندہ کہاں گیا

بکھرا تھا آسماں پہ اُجالا تمام رات
وہ چاند کیا ہُوا، وہ ستارا کہاں گیا

باقرؔ تمھارے دل کا سمندر اُداس ہے
ان پانیوں میں پیرنے والا کہاں گیا

خود بخود جل اُٹھے یادوں کے دریچوں میں چراغ
رات بھر جاگ اُٹھا درد پرانا دل کا

مشرق کے سوتے دیوتا کو کوئی اُفق پر لاؤ تو
کچھ اُمید کی روشن کرنیں دنیا کو دکھلاؤ تو
ٹوٹے پھوٹے برتن ہم نے پھینک دیے ہیں پچھواڑے
یارو اب اس دور کی دکانوں کے پتے بتلاؤ تو
نگری نگری دوارے دوارے لاکھوں مجنوں پھرتے ہیں
یہ لیلا کا دیس نہیں ہے کوئی انھیں سمجھاؤ تو
نیلے پیلے پھولوں ہی میں رہتی ہے کیا قید بہار
ذرہ ذرہ مہکے گا تم دل کے پھول کھلاؤ تو
جنگل جنگل سُونے سُونے دھرتی پیاسی پیاسی ہے
شاید مینھ برس جائے تم زلفوں کو لہراؤ تو
دیکھیں گے ہم سوئے حرم جاتے ہو یا مے خانے کو
ساغر کو اک بار تم اپنے ہونٹوں تک لے جاؤ تو

گھر میں بیٹھے بیٹھے باقرؔ کون تمھیں پہچانے گا
یہ محفل ہو یا وہ محفل نکلو آؤ جاؤ تو

سنتے تھے رنگ و نور کی دنیا ہے شہر میں
یہ کیا ہوا کہ ہر کوئی تنہا ہے شہر میں

ناراض ہو کے رات کی پریاں کدھر گئیں
کیوں اس قدر اُداس سویرا ہے شہر میں

کیا ہوگیا کہ حسن سے عاری ہوئے ہیں پھول
بے رنگ تتلیوں کا بسیرا ہے شہر میں

ہر جزر و مد کے ساتھ بدلتا ہے اپنا رُخ
جیسی ہوا ہے ویسا ہی دریا ہے شہر میں

پھرتے ہیں لوگ ڈالے ہوئے خوف کے نقاب
ہنستا ہوا بس ایک ہی چہرہ ہے شہر میں

آسمانوں پہ ہو رہا کیا ہے
یہ ستارہ سا ٹوٹتا کیا ہے

آج پھر شق ہوئی ہے کیوں دیوار
گھر مرا مجھ سے چاہتا کیا ہے

ملنے آئے ہو اور سناں بردوش
دوستو یہ تمھیں ہوا کیا ہے

قتلِ قاتل پہ کیسے دار و رسن
یہ بھی ہے جرم تو سزا کیا ہے

دو قدم چل کے پڑ گئے چھالے
یہ ترے گھر کا راستہ کیا ہے

maablib.org

کوئی ہر سنگھار کا پھول تھا جو تمام رات مہک مہک کے مرے وجود میں بس گیا
کہ لطیف ابرِ بہار تھا، مری خشک کشتِ حیات پر جو لہک لہک کے برس گیا

مرے سائبانِ حواس میں کوئی چاندنی سی اُتر گئی کوئی نرم دھوپ بکھر گئی
رگ و پے میں جیسے ہو موجزن وہی لمسِ تازہ وہی چبھن مرا جسم جس کو ترس گیا

کوئی ابروباد کا سلسلہ، کسی خوش جمال کا تذکرہ مرے جسم و جاں میں سما گیا
کوئی برق بن کے چمک گیا، کوئی جلترنگ سا بج اُٹھا، کوئی کان میں گھول کے رس گیا

مری بے حسی، مرا ولولہ، یہ خیال و خواب کا سلسلہ، کوئی ہجر تھا کہ وصال تھا
کوئی واہمہ! کوئی ناگ تھا جو غمِ حیات کے زہر سے مجھے رات چپکے سے ڈس گیا

maablib.org

کٹی عمر تمام تو زہر میں ڈوبی ہواؤں میں
چلو چل کے رہیں کسی دُور دراز کے گاؤں میں

جہاں حدِ نظر تک کھیتوں میں سرسوں کے پھول کھلیں
جہاں آم کے بور کی مست مہک ہو فضاؤں میں

کبھی کھیت کی مینڈھ پہ بیٹھ رہیں چلتے چلتے
ذرا دھول اُڑے، کوئی کانٹا چبھے کبھی پاؤں میں

کبھی چاندنی رات میں یادوں کی میٹھی سی ہوک اُٹھے
کوئی دُور سے بنسی کی تان اُڑائے فضاؤں میں

کبھی گاؤں کی گوری کے دل کے لبھانے کو شہر کی بات
کبھی نہر پہ ہو کبھی آم کے پیڑ کی چھاؤں میں

اس بار دیے اس نے ملال اور طرح کے
یوں ہے تو پھر اُٹھیں گے سوال اور طرح کے

اس سر کی طرف آتے ہیں ہر سمت سے پتھر
جس سر میں اُبھرتے ہیں خیال اور طرح کے

اے طائرِ آوارہ ذرا دیکھ کے اُڑنا
اس بار شکاری کے ہیں جال اور طرح کے

جب لوگ نئے ہیں تو نئی طرز سے سوچو
ہر حسن کے ہوتے ہیں جمال اور طرح کے

بدلے ہوئے آفاق ہیں، نو رنگ ہوائیں
اب چاہییں ہم کو پر و بال اور طرح کے

کچھ اور ہیں اس شہر کے آدابِ محبت
ہجر اور طرح کے ہیں وصال اور طرح کے

ہم جس کے لیے لائے تھے مہتاب کی چادر
اس نے تو بچھا رکھے ہیں جال اور طرح کے

بھڑکا گئے اک آگ تری آنکھ کے جگنو
ندی تری سانسوں کی بہا لے گئی سب کچھ

قدم قدم روش روش گلاب جاگنے لگے
یہ کیسے دفعتاً ہمارے خواب جاگنے لگے

یہ کون اپنے خشک لب کے پھول لے کے آ گیا
سحاب جھومنے لگے، سراب جاگنے لگے

اُتر رہے ہیں ماہتاب کوزۂ نگاہ میں
رگوں میں آرزو کے آفتاب جاگنے لگے

بس اک ترے طلسمِ لب کے ٹوٹنے کی دیر ہے
حروف بولنے لگیں کتاب جاگنے لگے

وہ معجزہ ترے بدن کے قرب کی کشش میں ہے
شباب گنگنا اُٹھے، شراب جاگنے لگے

تمام شہر تو شامل نئی سپاہ میں ہے
یہ کس بدن کی مہک ہے جو گردِ راہ میں ہے

بنے ہیں جس کے لیے سارے آہنی زیور
ابھی وہ مرحلۂ حسرتِ گناہ میں ہے

خدا سے شام و سحر بھیک مانگنے والے
یہ کیسا مارِ تکبر تری کلاہ میں ہے

گزرتے رہتے ہیں ہر روز آفتاب مگر
وہ اک ستارہ ابھی تک مری نگاہ میں ہے

پہنچ گیا ہے ستاروں میں دوزخی کافر
ہمارا شیخ ابھی اپنی خانقاہ میں ہے

نکل پڑے ہیں سفر پہ برادرانِ عزیز
ضرور پھر کوئی یوسف نصیب چاہ میں ہے

بجلی جو بدن میں ہے چمک جائے گی اک دن
یہ درد کی بستی بھی مہک جائے گی اک دن

چمکے گا مری بھیگی ہوئی آنکھ کا سورج
پیغام مرا لے کے دھنک جائے گی اک دن

وہ ہوشربا چاند ہے بادل میں چھپا ہے
یہ وہم کی چادر ہے ڈھلک جائے گی اک دن

بوئے ہیں بہت خواب کسانوں نے سحر کے
اُمید کی یہ فصل بھی پک جائے گی اک دن

برسیں گی کسی روز تو یہ بانجھ گھٹائیں
ندی بھی سرابوں کی چھلک جائے گی اک دن

تھم جائیں گے لمحات، ٹھہر جائیں گے موسم
رقاصۂ افلاک بھی تھک جائے گی اک دن

نہ صرف گلشنِ شاداب ہی مٹا دے گی
یہ ریت شہر کی بنیاد بھی ہلا دے گی

سنان و تیر بھی جھوٹے، کمان بھی نقلی
ہماری کم نگہی ہم کو اور کیا دے گی

یہ کیا غضب ہے، عدالت بھی شہر کی محکوم
جو خلق چاہے وہی فیصلہ سنا دے گی

خدا کے نام پہ مانگو تو کچھ ملے تم کو
بتوں کے نام پہ کیا خلقتِ خدا دے گی

پسند درد کرو گے تو زخم ہوں گے سوا
جو ہنس پڑو گے تو دنیا بھی مسکرا دے گی

تمھارے شہر میں عجیب انتخاب ہو گئے
کہ خار دیکھتے ہی دیکھتے گلاب ہو گئے
ذرا سی دھوپ کیا لگی مزاج ہی بدل گیا
طہارتِ عنب کو چھوڑ کر شراب ہو گئے
ہمالیہ کی برف تھے، عظیم تھے بلند ظرف تھے
بلندیوں سے گر کے سندھ اور چناب ہو گئے
جو تیر در کمان تھے، جو چوب و ریسمان تھے
وہ آج خیمۂ حیات کی طناب ہو گئے
بڑا ستم ہوا کہ ایک صفحۂ جنوں لکھا
تمام شہر کے لیے کھلی کتاب ہو گئے
چلو تمھاری بھی پرانی حسرتیں نکل گئیں
لگا کے زخم تم بھی داخلِ ثواب ہو گئے

چلی تھی بات اشک سے مگر لہو تک آ گئی
تمھارے قرض تو یہود کے حساب ہو گئے

میں بھی ترے سپاس کا امیدوار ہوں
میرا بھی ایک تار ترے پیرہن میں ہے

زیب دیتی نہیں عشق کی دل لگی غم زدہ، سوگواروں کے سنگ
کھیل کا حوصلہ ہو تو کھیلو کبھی کھیل بھی تاج داروں کے سنگ

اب غریبوں کے دامن میں کچھ بھی نہیں صرف گنجائشِ چاک ہے
کان کی لَو کا تازہ لہو بھی تھی لے گئے گوشواروں کے سنگ

ہم سدا کے کوئی نوحہ گر مرثیہ خواں نہیں، وقت کی بات ہے
ہم نے بھی گیت گائے ہیں پھولوں کے صحراؤں کے آبشاروں کے سنگ

اس کھلی دھوپ میں تم کو کانٹوں بھری راہ چلنا بھی مشکل ہے کیا
ہم تو بے چاند راتوں کے صحراؤں میں بھی چلے ہیں ستاروں کے سنگ

لوگ کیوں روز لکھتے ہیں نعرے نئے، کیوں بناتے ہیں در کے نشاں
خلقتِ شہر کے واسطے کچھ بھی ہو، دل لگی ہے دیواروں کے سنگ

روشن ہے کوئی بام نہ شمعیں ہیں دروں میں
کیوں لوگ چھپے بیٹھے ہیں کاغذ کے گھروں میں

شعلوں کی طرح جسم بھی کر جائے گا پرواز
یہ سوچ کے ہم آگ لگا بیٹھے پروں میں

شاید ملک الموت بھی حیران ہوا ہو
بیمار کا وہ حال ہوا چارہ گروں میں

ہے سیپ اگر بانجھ تو کیا روئیں گہر کو
دیدے بھی نظر آتے نہیں دیدہ وروں میں

سجتے نہیں یہ دیدہ و دل جسم پہ یا رب
کیا لعل و گہر رکھ دیے مٹی کے گھروں میں

جس سے دل پانی ہوا تھا وہ فسوں اچھا لگا
آج وہ بے مہر مجھ کو جانے کیوں اچھا لگا

غرقِ حیرت ہوں کہ آوارہ مزاجی کیا ہوئی
مدتوں کے بعد پھر مجھ کو سکوں اچھا لگا

تحفۂ رنگِ حنا دوں دستِ تیر انداز کو؟
بے تحاشا آج اپنے دل کا خوں اچھا لگا

عمر بھر کی نم زدہ بے کیف برساتوں کے بعد
دھوپ سے پُر آسمانِ نیلگوں اچھا لگا

کس قدر بے کیف اور بے لطف تھے قلب ونظر
زخم سے ہی خوش ہوا دریائے خوں اچھا لگا

حلقہ بگوشِ وقت ہنر مند کیوں رہیں
ہم حریت پسند ہیں پابند کیوں رہیں

صورت جدا، مزاج جدا، عادتیں جدا
پھر ہم کسی نظام کے پیوند کیوں رہیں

سرزد ہوئے ہیں کون سے ایسے بڑے گناہ
ہر فعلِ ناسزا پہ رضا مند کیوں رہیں

وا کر دیے گئے ہیں نہاں خانہ ہائے دل
آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو در بند کیوں رہیں

ناوقت خامشی بھی ہے کتنا بڑا گناہ
گویائی ہے زباں میں تو منھ بند کیوں رہیں

نہ کوئی حرف، نہ خواہش، نہ حوصلہ ہے مجھے
میں سوچتا ہوں کہ آخر یہ کیا ہوا ہے مجھے

نہ اب اُداس ہیں صبحیں نہ کاٹتی شامیں
نہ کوئی خواب میں آ کر جھنجھوڑتا ہے مجھے

کچھ اور کیجیے تسکینِ خواب کی صورت
فریب کار اُجالوں سے واسطہ ہے مجھے

مرے لہو سے جو کرتا تھا آرزوئے حنا
نہ جانے کیوں وہ بری طرح چاہتا ہے مجھے

یہ اب کے بار جو رُک کے آ رہی ہے بہار
ٹھہر ٹھہر کے کوئی زہر دے رہا ہے مجھے

صدا تو ہے کوئی مانوس سی مگر پُر ہول
یہ کون شام کو اکثر پکارتا ہے مجھے

مجھ کو ہوتے ہیں فلک سے یہ اشارے کیسے
آج کل ٹوٹتے رہتے ہیں ستارے کیسے

کوئی تو ہوگا پسِ پردۂ موسم ورنہ
آپ ہی آپ بدلتے ہیں نظارے کیسے

قدرتِ فکر ہے منجملۂ آثارِ حیات
بوجھ احساس کا انسان اُتارے کیسے

سرخ رو ہو کے بھی رکھتے ہیں تمنا باقی
آگ بجھ جائے تو اُٹھیں گے شرارے کیسے

روکنا چاہو تو آ جاؤ سمندر ہو کر
بہتا دریا ہوں میں لگ جاؤں کنارے کیسے

ایسی تنہائی میں اک میں تھا جو گھبرایا نہ تھا
شہر تو اپنا تھا لیکن کوئی ہمسایا نہ تھا

جسم سب بلور کے، سارے مکاں شیشے کے تھے
دھوپ بکھری تھی مگر کوسوں کوئی سایا نہ تھا

بادلوں سے آگ برسی، ریت سے اُبھرے گلاب
ایسا موسم آج تک شاید کبھی آیا نہ تھا

جانے کیوں پایاب جھیلیں بھی سمندر ہوگئیں
ہم نہ روئے تھے، کوئی سیلاب بھی آیا نہ تھا

پیشۂ سوداگری نے رکھ لی اپنے دل کی لاج
اس کے در پر تھے اگرچہ اس نے بلوایا نہ تھا

کیوں نمائش کے لیے پھرتا نہ جگنو کی طرح
عشق کی آتش سے بڑھ کر کوئی سرمایا نہ تھا

رات تھی لیکن نہ اُبھرا تھا اُفق پر ماہتاب
اس نے جب تک ریشمی زلفوں کو بکھرایا نہ تھا

اس دورِ پُرآشوب میں ہنستا ہوا چہرہ
آتش گہِ نمرود میں اک پھول کھلا ہے

ہوش سے بڑھ کر ہمیشہ ہم کو خواب اچھا لگا
دوسرے کے صحن میں کھلتا گلاب اچھا لگا

اک خلش دل میں ہمیشہ اپنے بارے میں رہی
خوف پانی سے رہا لیکن سراب اچھا لگا

حسنِ یوسف کے جو سچ پوچھو تو ہم قائل نہیں
ہاں مگر ہم کو زلیخا کا جواب اچھا لگا

ہم عجب انسان ہیں ابلیس سے ڈرتے رہے
اور دل ہی دل میں ہر کارِ عذاب اچھا لگا

بحر کی تہہ میں چھپے موتی سے کیا لینا ہمیں
جو اُبھر آیا وہ باہمت حباب اچھا لگا

ہم بہت شاکی تھے ناحق نازنینِ شرق سے
بے حجابی دیکھی تب اس کا حجاب اچھا لگا

اس قدر اُکتا چکے تھے جی حضوری دور سے
ہر نئے حاکم کا اندازِ عتاب اچھا لگا

دُور اک جزیرے پر کر لیا ہے گھر اپنا
اب یہی وطن اپنا، اب یہی نگر اپنا
اپنی خلوتوں میں اب جھانکتا نہیں کوئی
زندگی میں پہلی بار اپنا گھر ہے گھر اپنا
ہے زبان اپنی صرف اپنی سوچ کی تابع
اپنا دل ہے دل اپنا، اپنا سر ہے سر اپنا
روز اپنے آنگن میں تازہ پھول کھلتے ہیں
مژدہ لے کے آتا ہے روز نامہ بر اپنا
زہر اس کے ہونٹوں کا کتنا پُراثر نکلا
رُک گئے قدم اپنے کٹ گیا سفر اپنا
جس کو لوگ کہتے ہیں عرفِ عام میں منزل
اس مقام سے آغاز ہوتا ہے سفر اپنا

وہ جو کچھ نہ کر پائے، ہم جو مٹ گئے آخر
داستاں طویل ان کی، قصہ مختصر اپنا

راز بن برسی گھٹاؤں کے گزرنے کا کھلا
جب نمو کی آرزو میں سوکھتے دانے ملے

اپنی زباں کا قرض ادا کر رہا ہوں میں
خاموش وادیوں میں ندا کر رہا ہوں میں

مجھ کو سزائے عفو عطا کر مرے خدا
پھر ارتکابِ جرمِ دعا کر رہا ہوں میں

اُترا سمندروں میں تو گوہر ملے مجھے
کیا چاہیے جو سیرِ فضا کر رہا ہوں میں

بھولا نہیں سبق جو گناہ و ثواب کا
یوں بچپنے سے قتلِ انا کر رہا ہوں میں

کس جرم میں ہوا در و دیوار کا اسیر
صحرا کی وسعتوں سے گلا کر رہا ہوں میں

جیتا ترے بغیر ہوں اے قبلۂ حیات
گویا نمازِ عمر قضا کر رہا ہوں میں

جب سے ہم اس شہر میں اپنا شیشے کا گھر لے آئے
جتنے دوست ہوئے تھے اپنے سارے پتھر لے آئے

قطرہ قطرہ پانی پا کر کتنے گلشن سوکھ گئے
اک چلو کی پیاس کی خاطر لوگ سمندر لے آئے

یا سوداگر جادوگر تھا یا ہم ہی دیوانے تھے
سُکھ کے پیراہن کے بدلے دُکھ کی چادر لے آئے

اس اُمید میں کتنے پیاسے پتھر صدیاں کاٹ چکے
اک دن شاید نہر کنارے کوئی ٹھوکر لے آئے

اتنے پھیلے شہر میں تم کو اور کوئی چہرہ نہ ملا
باقرؔ تو پہلے ہی بہت تھے تم بھی باقرؔ لے آئے

بے رنگیِ سکوت سے پھر ڈر لگا مجھے
اے دوست آ کے پھر کوئی نشتر لگا مجھے

انسانیت کے غم میں جو ٹپکا تھا ایک اشک
وہ وسعتوں میں مثلِ سمندر لگا مجھے

کچھ اور تازہ رنگ بھروں کائنات میں
اے جذبۂ خیال نئے پر لگا مجھے

جب تھا قریب لمحۂ تکمیلِ آرزو
اس وقت اپنے آپ سے بھی ڈر لگا مجھے

ہر سُو، بقول آپ کے، رہتے ہیں میرے دوست
پھر کس طرف سے آ کے یہ پتھر لگا مجھے

باقرؔ کروں نہ کیسے اسی کی میں پیروی
ہر فعل جس کا مرضیِ داور لگا مجھے

زخم پھر مسئلۂ چارہ گراں ہے کہ جو تھا
وہ مسیحا ہی مرے درد کی جاں ہے کہ جو تھا

ایک آسیب تعاقب میں ہے جانے کب سے
تیر اک اب بھی مری سمت رواں ہے کہ جو تھا

کس پہ الزام دھروں نیند کی رُسوائی کا
اب کوئی درد مرے دل میں کہاں ہے کہ جو تھا

بند باندھے سے نہ سیلاب نہ طوفان رُکے
وہی دریا ہے اُسی سمت رواں ہے کہ جو تھا

تاجِ اقلیمِ مسرت ہے مرے سر پہ مگر
زخم کا سر پہ اسی طرح نشاں ہے کہ جو تھا

بارشِ سنگ کے باوصف بھی پیمانۂ دل
شاہکارِ ہنرِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

ریگستان کے بیچ سے بہتا دریا ہوں
آہستہ آہستہ بھرتا جاتا ہوں

جذبہ بن کر اٹھتا ہوں ہر روز مگر
آنسو بن کر آنکھوں سے گر جاتا ہوں

کیا قلزم کیا دریا کیا تالاب مجھے
پانی ہوں ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہوں

سچی باتیں کہہ کہہ کر کیا حال کیا
سو پھولوں کے نرغے میں اک کانٹا ہوں

امن کی خاطر سی لیتا ہوں لب اپنے
لوگ سمجھتے ہیں میں شاید گونگا ہوں

جب سے در بند ہوئے وہم کی دیواروں سے
روشنی دل میں ہوئی یاد کے انگاروں سے

مجھ کو حیرت ہے کہ قائم ہیں مرے ہوش و حواس
رات دن بات کیا کرتا ہوں دیواروں سے

دل میں پیوستہ رہے کتنے مسیحا لیکن
ہم دوا مانگتے پھرتے رہے بیماروں سے

روز کچھ ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر کیوں ہم لوگ
ہاتھ خالی لیے لوٹ آئے ہیں بازاروں سے

لوگ پوچھیں گے تو دے دیں گے ترے گھر کا پتا
قید کا ذکر ہی ملتا ہے گرفتاروں سے

اس منہ سے نکلتی نہیں چھوٹی سی دعا بھی
اک ہم ہیں کہ سر لیتے ہیں اوروں کی بلا بھی

کس دور کی روداد سنائیں تو سنو گے
یہ شہر کئی بار بسا بھی ہے لٹا بھی

ریزوں کی طرح پاؤں میں چبھنے لگی شبنم
لگتا ہے طمانچے کی طرح دستِ صبا بھی

خاکسترِ جاں سے تو دھواں بھی نہیں اٹھا
خالی گئی اب کے ترے دامن کی ہوا بھی

منصف بھی وہی لوگ ہیں قانون ہے جن کا
اک ڈھونگ ہے یہ سلسلۂ جرم و سزا بھی

اک گرد اُڑ رہی ہے مسلسل ہوا کے ساتھ
کب تک چلا کرے کوئی پاگل ہوا کے ساتھ

خوشبو تری گلی میں پریشاں ملی ہمیں
کیا پھر اُلجھ پڑا ترا دامن ہوا کے ساتھ

موجِ خیالِ یار اُڑائے پھری ہمیں
اُڑتا پھرے ہے جیسے کہ بادل ہوا کے ساتھ

چتوؔ! فراقِ شاخ سے انکار کب تلک
اُڑنا پڑے گا آج نہیں کل ہوا کے ساتھ

زخم کی گود میں سوئے ہوئے نشتر نکلے
کتنے شہ زور درونِ تنِ لاغر نکلے

وقت اب کوچۂ خوباں کے لیے راس نہیں
راہ وہ ڈھونڈ جو اس شہر سے باہر نکلے

آرزو ہے کہ کسی شخص کو میں دوست کہوں
چاہتا ہوں کہ کوئی میرے برابر نکلے

آج ہر شخص یہی سوچ رہا ہے ہمہ وقت
حلقۂ دار سے کس طرح مرا سر نکلے

تمام زندگی اسی طرح بسر ہوئی تو کیا
غموں کی رات جھیل کر اگر سحر ہوئی تو کیا

بڑھی ہیں پھر اسی طرح دکھوں کی خشک ندیاں
شکستہ بازوؤں کو دیر سے خبر ہوئی تو کیا

پڑیں گے جب کہ سارے مرحلے تو پھر یہ زندگی
طویل ہوگئی تو کیا، جو مختصر ہوئی تو کیا

کٹے ہیں ہاتھ آنکھ پر بندھی ہوئی ہیں پٹیاں
نوشتۂ ازل کی پیش تر خبر ہوئی تو کیا

پکارتے ہیں آب آب ذرہ ہائے دشتِ دل
قبائے نم ملی تو کیا، مژہ بھی تر ہوئی تو کیا

سلوکِ دوستاں سے سرد سارے حوصلے ہوئے
اگر ہمارے دشمنوں کو بھی خبر ہوئی تو کیا

خلائے جسم و روح جب کہ تشنۂ قدم رہیں
تمھی کہو کہ منزلِ قمر بھی سر ہوئی تو کیا

سنا ہے ٹڈیوں کا دَل بھی آ رہا ہے اس طرف
ہماری فصل اب کے سال خوب تر ہوئی تو کیا

کیسے کیسے بھیس میں لائی ہے عریانی مجھے
تشنگی کے نیش سے ڈستا رہا پانی مجھے

خوف سے طوفاں کے دھمکاتی رہی بادِ نسیم
بگڑے بگڑے نقش دکھلاتا رہا پانی مجھے

کتنے پُراسرار ہیں اس شہر کے شور و سکوت
کس جزیرے پر اُٹھا لائی ہے طغیانی مجھے

میں زمیں پر ڈھونڈتا ہی رہ گیا نقشِ ثبات
منھ چڑاتا ہے خلا سے اک تنِ فانی مجھے

سوچ سے معمور آنکھیں تہہ بہ تہہ ماتھے پہ بل
لگ گئی ہے ساری دنیا کی پریشانی مجھے

سوچا ہے کہ اب حسرتِ دنیا نہ کریں گے
مل جائے جو لے لیں گے تمنا نہ کریں گے

ان پاؤں کے چھالوں سے تو انصاف نہ ہوگا
گر تذکرۂ وسعتِ صحرا نہ کریں گے

ہم اپنے لیے آپ ہی بن جائیں گے سایہ
دیوار کے سائے پہ بھروسا نہ کریں گے

بازار میں لے آئے تھے سو دیکھ لیا مول
اب اپنی کسی چیز کا سودا نہ کریں گے

کچھ اور بنا لیں گے اسی سنگِ گراں سے
اصنام کو منت کشِ تیشہ نہ کریں گے

رحم و کرم پہ دھوپ کے رہتا نہیں ہوں میں
انسانِ سایہ دار ہوں سایا نہیں ہوں میں

ہر زاویے سے دیکھ رہا ہوں حیات کو
تم یہ سمجھ رہے ہو کہ سمجھا نہیں ہوں میں

کوئی ہماری راہ میں کانٹے بچھائے کیوں
پتھر ہوں کوئی آبلۂ پا نہیں ہوں میں

رہتا ہوں خس کے شہر میں آتش نفس بھی ہوں
اس بے ثبات آگ میں جلتا نہیں ہوں میں

پروردۂ بہار نہ برگشتۂ خزاں
دیوار پر اُگا ہوا سبزا نہیں ہوں میں

کشتی پہ بیٹھ کر جسے تم پار کرسکو
دو ساحلوں کے بیچ کا دریا نہیں ہوں میں

ہر بار نئے نقش بنا دیتی ہیں لہریں
پھر خود ہی انھیں آ کے مٹا دیتی ہیں لہریں

ٹکرا کے چٹانوں سے تو مڑ جاتا ہے دریا
اور ریت کی دیوار گرا دیتی ہیں لہریں

بازو میں ہو گر زور تو ملتا ہے سہارا
ورنہ ابدی نیند سلا دیتی ہیں لہریں

یاں ریگ نما دشت ہے یا سنگ نفس شہر
ساحل پہ کسے آ کے صدا دیتی ہیں لہریں

ساکن تھا کئی صدیوں سے اس جھیل کا پانی
ملاح کے بازو کو دعا دیتی ہیں لہریں

نذرِ ناصر کاظمی

میں جب بستر پر لیٹا تھا — کالا سانپ سا اک لپٹا تھا
آنکھوں کی دہلیز کے اوپر — کانٹوں کا پردہ لٹکا تھا
بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی — برف کا جادو بول رہا تھا
گلیاں سب روشن روشن تھیں — سڑکوں پر کہرا چھایا تھا
لہر لہر باتیں کرتی تھی — قلزم گم سم دیکھ رہا تھا
ساگر کے چوڑے سینے پر — دریا کا آرا چلتا تھا
سوکھے پتھریلے صحرا میں — رنگوں کا میلا لگتا تھا
کھنڈر کی خستہ دیواروں پر — وقت کا اُلو بول رہا تھا
غار سے آوازیں آتی تھیں — جیسے دیو کوئی ہنستا تھا
سینے کے بے در پنجرے میں — دل کا مٹھو بول رہا تھا

سارے جنگل میں منگل تھا
پورا شہر اُجاڑ پڑا تھا

آفرینش سے شریکِ کارواں ہے روشنی
ہے کبھی برف اور کبھی آتش فشاں ہے روشنی

قمقموں کے شہر میں جلتے ہیں مٹی کے دیے
روشنی کے حال پر نوحہ کناں ہے روشنی

دھوپ ہے سارے بدن پر اور جلا جاتا ہوں میں
سب سمجھتے ہیں کہ مجھ پر مہرباں ہے روشنی

ہے وہی گردش، وہی دنیا مگر اب کیا ہوا
تھے کبھی سائے گریزاں اب دواں ہے روشنی

مشعلِ جاں لے کے مجھ کو راہ دکھلاتی رہی
اور مائیں ہوں گی سایہ میری ماں ہے روشنی

بھلا تھا کون سا پہلے جو اب خراب بنا
اُلٹ پلٹ کے ورق اک نئی کتاب بنا

کچھ اب کے بار مقدر سے نیک کام ہوا
جو ہوش ہوش بگاڑا تھا خواب خواب بنا

کرے نہ گردشِ ایام بھی جدا ہم کو
زمین بن کے مجھے اپنا آفتاب بنا

وہ اپنی زلف میں ہر دم سجائے پھرتا تھا
یہ غنچہ جب سے مہکتا ہوا گلاب بنا

ہزار رمز کے پہلو دکھایا گیا مجھ کو
وہ ایک ذرّہ جو پل بھر کو آفتاب بنا

دعائیں دیتا گیا کنکری کو ساحل تک
وہ ایک نقش جو بالائے سطحِ آب بنا

یہ کون تھے جو مثلِ نسیمِ سحر آئے
احساس میں ضم ہو گئے سانسوں میں در آئے

دامن کو سمیٹے ہوں سمیٹے ہی رہوں گا
اب تو تری یادوں کے ستارے سمٹ آئے

اک شب کے لیے بھی کہیں مہماں نہ ہوئے ہم
جب شام ہوئی لوٹ کے اپنے ہی گھر آئے

ہو جلوہ نما شب کے اندھیرے سے کوئی نور
پھر بامِ اُفق پر کوئی سرخی نظر آئے

پھر صحنِ چمن میں کوئی آہٹ سی ہوئی ہے
اللہ کرے اب کوئی اچھی خبر آئے

اک پیڑ لگایا تو ہے ویرانۂ دل میں
اب دیکھیے کب پھول کھلیں کب ثمر آئے

میں قیس نہیں ہوں کہ رہوں بے سر و ساماں
صحرا میں بھی ہمراہ مرے بام و در آئے

جو ایک شب کی حرارت میں بن کے اُٹھی ہو
شراب کیا، وہ نشہ کیا، سرور کیا اس کا

یہ مت سمجھو تمھی سے سرگراں ہوں
میں اپنے آپ سے بھی بدگماں ہوں

ہلاؤ لب کبھی میرے لیے بھی
فسانہ ہوں کہ محتاجِ بیاں ہوں

اُبھرتا ہوں میں دونوں وقت ملتے
سرودِ غم ہوں، مغرب کی اذاں ہوں

خوشی، غم، حسرتیں اور جانے کیا کیا
اکیلا ہوں مگر اک کارواں ہوں

ہمارے آنگن کی بیل پھولی تو ہم یہ سمجھے بہار آئی
حواس کے تار جھنجھنائے، جنوں کی کوئل پکار! آئی

دریچۂ خواب سے گزر کر یہ کون آیا ہے چپکے چپکے
مرے خیالوں کی لاجونتی حیا کی چادر اُتار آئی

دبی ہوئی آگ کو جگایا، بلکتے زخموں کو چین بخشا
کسی کے دل کا قرار لوٹا، کسی کے گیسو سنوار آئی

بکھر گئی کس کے پیار کی دھوپ پک گئے کھیت خواہشوں کے
یہ کس کے چاہت کی بہتی گنگا ہمارے گھر بار بار آئی

وہ چاندنی کا سہاگ تھا جو خموش لمحوں کا راگ تھا جو
اگر کسی شام وہ نہ آیا تو شب بھی گھنگھرو اُتار آئی

آرزو سے دیکھتا ہے تشنہ لب صحرا مجھے
پھر سمندر کی طرف لے جائے گا دریا مجھے

میں پجاری روشنی کا، رات کے نرغے میں ہوں
اے مرے ماتھے کے سورج تو ہی اب چمکا مجھے

گھیرتے ہیں ہر طرف سے سرمئی آنکھوں کے غول
اتفاقاً دیکھ لیتے ہیں اگر ہنستا مجھے

اک تبسم پر ہوا عقل و خرد کا فیصلہ
میرے دل نے بیچ ڈالا کس قدر سستا مجھے

چھپ رہوں تو آئے ہے عمرِ گریزاں کی صدا
سامنے جاؤں تو بہکاتا ہے آئینہ مجھے

ہر سفر میں ساتھ رکھتا ہوں تری گلیوں کی خاک
بچپنے کے شہر تجھ سے پیار ہے کتنا مجھے

جب سے روٹھا ہے مرے درد کا بانی مجھ سے
کوئی سنتا ہی نہیں میری کہانی مجھ سے

قحط آنے کو ہے آنکھوں میں سمو لو مجھ کو
کہہ رہا ہے یہ برستا ہوا پانی مجھ سے

کیا بتاتا میں تیری زلفِ معنبر کا پتا
پوچھنے آئی تھی کل رات کی رانی مجھ سے

حافظہ یاد طلب خواب طلب ہیں آنکھیں
مجھ کو مانگے مری تصویر پرانی مجھ سے

جیب لوٹی گئی دامن کا جگر چاک ہوا
اب لہو مانگنے والی ہے گرانی مجھ سے

جو نیکیوں کے عوض ہر برائی دیتا ہے
نجانے کیوں وہی اچھا دکھائی دیتا ہے

ابھی اُٹھا ہی کہاں ہے وہ آرزو کا ستون
جو روز خواب میں گرتا دکھائی دیتا ہے

مری تلاش کا حاصل، وہ میری جاں کا شریک
جدا نہ ہو کے بھی لطفِ جدائی دیتا ہے

میں اس خدا کا پرستار ہوں جو بندوں کو
عطا پہ آئے تو ساری خدائی دیتا ہے

جو چھینتا ہے چراغوں کی روشنی باقرؔ
وہی قلم کو مرے روشنائی دیتا ہے

مجھ پہ احسان کیے تیری جفا نے کیا کیا
آج یاد آئے ہیں پھر درد پرانے کیا کیا

لطف، آزادیٔ دل، پیار، تبسم، آنسو
مفلسوں نے بھی لٹائے ہیں خزانے کیا کیا

رُوپ دھارا ہے خوشی کا کبھی غم کی صورت
حادثوں نے بھی تراشے ہیں بہانے کیا کیا

جز عبادت نہ کوئی کام فرشتوں سے لیا
بوجھ انسان پہ ڈالے ہیں خدا نے کیا کیا

سچ تو یہ ہے کہ کوئی خاص ہنر مجھ میں نہیں
لوگ کہنے کو تو کہتے ہیں نہ جانے کیا کیا

کیا جانے کہاں تھے دشت سارے پھرتے رہے ابر مارے مارے

آیا نہ کوئی ہوا کا جھونکا جلتے ہی رہے چراغ سارے

یہ رات ہے یا کوئی جواری ہارا ہوا مال ہیں ستارے

آنکھوں میں سما گیا ہے کوئی آنکھوں کی نظر کوئی اُتارے

دو اشک خلوص کے بہت ہیں ہم کو نہیں چاہییں ستارے

پانی میں لہو بہا تھا لیکن دونوں کے الگ الگ تھے دھارے

پھرتے ہیں بساطِ درد لے کر
شاید کوئی ہم سے بازی ہارے

راستہ پہلے غلط اس نے دکھایا ہے مجھے
اور اب دشت میں خود ڈھونڈنے آیا ہے مجھے
زرد پتا ہوں جو گل دان کے قابل بھی نہیں
جانے کیوں شاخ سے وہ توڑ کے لایا ہے مجھے
دیکھوں کیا مانگتا ہے اپنی عطاؤں کا صلہ
زخم دے دے کے بہت اس نے سجایا ہے مجھے
میں تو خاموش تھا اک بربطِ ارماں کی طرح
کسی مضراب کی جنبش نے جگایا ہے مجھے
ایسی منزل کا پتا دے کے جو موجود نہیں
دشت در دشت اکیلا ہی پھرایا ہے مجھے
چند لمحوں کی خوشی کے لیے اے دل تو نے
رفعتِ غم کی بلندی سے گرایا ہے مجھے

جلد اے چاند نکل آ بھی کہ اس نے اب کے
چاندنی رات میں پنگھٹ پہ بلایا ہے مجھے

درد ایسا ہے کہ سینے میں سماتا بھی نہیں
ہنسنے دیتا بھی نہیں اور رُلاتا بھی نہیں

پہروں پھرتا ہوں اندھیروں کے گھنے جنگل میں
کوئی آسیب مجھے آ کے ڈراتا بھی نہیں

ایک تنکا ہوں، پڑا ہوں سرِ ساحل کب سے
کوئی جھونکا مجھے پانی میں بہاتا بھی نہیں

سادہ سادہ سحر و شام گزر جاتے ہیں
کوئی لڑتا بھی نہیں کوئی مناتا بھی نہیں

یا وہ موتی تھا کہ بالوں میں گندھا رہتا تھا
گم گیا ہوں تو کوئی ڈھونڈنے آتا بھی نہیں

ایک دیوار ادھوری ہی پڑی ہے کب سے
آپ گرتی بھی نہیں کوئی اُٹھاتا بھی نہیں

لمحۂ شوق بھی ہم رنگِ بلا ہوتا ہے
تم نہ ہو ساتھ تو موسم بھی خفا ہوتا ہے

دل وہی ہے کہ جسے غم کی سعادت ہو نصیب
درد وہ ہے کہ جو محرومِ دوا ہوتا ہے

اس کو دلدار کہوں یا اسے دشمن جانوں
درد کے بھیس میں جو دل میں چھپا ہوتا ہے

میں ہوں آئینہ صفت مجھ میں کہاں تابِ فریب
جو مرے دل میں ہو چہرے پہ لکھا ہوتا ہے

بارآور ہوئی یوں تازہ بہ تازہ کی تلاش
روز پلکوں پہ مرے اشک نیا ہوتا ہے

سادگی ایسی بھی اچھی نہیں ہوتی باقرؔ
وہی کہتے ہو جو لوگوں سے سنا ہوتا ہے

ہے گیسوؤں کا فیض جو نم ہے گھٹاؤں میں
خوشبو ترے بدن کی گھلی ہے ہواؤں میں

نس نس میں بس رہی ہے ترے قرب کی مہک
بیٹھا ہوا ہوں گویا چنبیلی کی چھاؤں میں

تم سے ملے تو کچھ ہمیں محسوس یوں ہوا
اب تک رہے ہوں جیسے اندھیری گپھاؤں میں

ٹھنڈک نے تیرے پیار کی ہم کو بچا لیا
مدت سے جل رہے تھے سے کی چتاؤں میں

maablib.org

ہم بہاروں میں بھٹکتے رہے خوشبو کی طرح
آرزو رات کی کرتے رہے جگنو کی طرح

تو سمایا تو ہے احساس میں جادو بن کر
ہم ترے ساتھ رہیں گے تری خوشبو کی طرح

بس کسی طرح گزر جاتے ہیں دن تیرے بغیر
کام کر لیتے ہیں ٹوٹے ہوئے بازو کی طرح

گو تعاقب میں رہے کتنے اُجالوں کے ہجوم
ہم تری یاد چھپائے رہے جگنو کی طرح

مدتوں بعد کہیں آئی ہے شبنم اب کے
جذب کر لیجیے رومال میں آنسو کی طرح

ہو گئے جس کے سدا اس کے طرف دار رہے
ہم نہ اُٹھتے ہیں نہ جھکتے ہیں ترازو کی طرح

دے کوئی موسم کو درس جوانی کا
سوکھے ہوئے بادل کو تحفہ پانی کا

یارو کب تک بچوں کو بہلاؤ گے
سنا سنا کر قصہ راجا رانی کا

ہوتا ہے آغاز تو آتش بازی سے
جانے کیا ہوگا انجام کہانی کا

ہوش وروں کے روشن شہر میں سو سو کر
پیٹ نکل آیا ہے اک دیوانی کا

باقرؔ کچھ دل میں بھی داغ سجا رکھو
کام نہ دے گا صرف نشاں پیشانی کا

کس کس کی محراب بجی ہے دیکھو تو
دنیا کس کو بھول گئی ہے دیکھو تو

کتنی آنکھیں سو سو کر بے نور ہوئیں
کس خوابوں کی فصل کٹی ہے دیکھو تو

تم کہتے تھے سارے لوگ برابر ہیں
کس کس گھر میں آگ لگی ہے دیکھو تو

راہی کے بوجھل واماندہ پیروں پر
کن راہوں کی دھول اٹی ہے دیکھو تو

خلقِ خدا نے جس کو سدا ناپاک کیا
آج وہی دیوار بجی ہے دیکھو تو

پردے کھینچ کے سونے والو اٹھو بھی
دیواروں تک دھوپ چڑھی ہے دیکھو تو

صبح کے منھ پہ کالک مل کے تارے تو چمکائے
اس اندھیر میں اے مورکھ سورج نہ کہیں کھو جائے

بھوک سے پیٹ پہ پتھر باندھے اس پر اَن داتا
پانی کی اک بوند نہیں پھر بھی بادل کہلائے

پھوٹے گا ہر پور سے ورنہ آگ کا اک محلول
اچھا ہے خوابوں کا سمندر آنکھوں سے بہہ جائے

میرے اندر چھپ کر بیٹھا ہے اک چھاپا مار
ہر دم اپنا حکم چلائے، اپنی ہی منوائے

یہ کیسا سنگیت ہے باقرؔ جس میں ہر اک موجود
اپنا اپنا ڈھول بجائے، اپنی اپنی گائے

روپ سہاگن کا ہے من ہے ودھوا کا
ہم نے یہ بہروپ بھی دیکھا دنیا کا

کتنی دیر ہوئی ہے اک پہلو بیٹھے
پیر کہیں سو جائے نہ پیاری رادھا کا

بستی، جنگل، صحرا سب غرقاب ہوئے
جب بھی کسی نے روکا رستہ دریا کا

دونوں پانی اک پل میں مل جائیں گے
سنگم جب بھی ہوگا گنگا جمنا کا

روز کوئی دہلیز سجائی جاتی ہے
پڑتا ہے ہر رات کسی کے گھر ڈاکا

جس کے کوچے سے چشمہ نکلا
اس بستی کا ہر باسی پیاسا نکلا

ہم جس کو نظروں کا دھوکا سمجھے تھے
وہ منظر تو سچ مچ کا دریا نکلا

سورج اپنی آگ میں جل کر راکھ ہوا
تب جسموں کے اندر کا سایا نکلا

جس پر میرا نام لکھا تھا، نجانے کیوں
قرعے میں ہر بار وہی پرچا نکلا

لڑکی جب ساری بارش میں بھیگ گئی
تب جا کر اس کا اصلی چہرا نکلا

دل کو باقرؔ جان بدن سمجھے تھے مگر
موہنی صورت والوں کا جھولا نکلا

وادیِ زیست سے کچھ ایسے ہنر سے گزرے
حادثے جتنے بھی گزرے میرے سر سے گزرے

قابلِ داد ہیں آنکھیں کہ ہیں اب تک روشن
کیسے کیسے تھے مناظر کہ نظر سے گزرے

ہم نے دیکھا کہ لٹکتا رہا سردار کا سر
اور سب قافلے والے اُسی در سے گزرے

سنگِ در ہو کے رہوں ایسی تمنا بھی نہیں
عمر ہی جس میں کٹے ایسے سفر سے گزرے

چند تھے جن پہ عنایات ہی برسیں ورنہ
سب، فقیروں کی طرح عالمِ زر سے گزرے

کچھ گھروں پہ پھولوں کی ڈالیاں برستی ہیں
خس کے سائبانوں پر بجلیاں برستی ہیں

جن پہ ہر طرف سبزہ، جن کے چار سُو پانی
بس اُنھی جزیروں پر بدلیاں برستی ہیں

تم خزاں کے عالم میں پھول توڑنے نکلے
جان! ایسے موسم میں پتیاں برستی ہیں

رات دن دعائیں جو مانگتے ہیں لڑکوں کی
ان گھروں پہ جانے کیوں لڑکیاں برستی ہیں

گلشن سوکھا، جنگل سوکھا، صحرا سوکھ گیا
سورج اب کے ایسا چمکا، دریا سوکھ گیا

اُجرت کی اُمید میں صدیوں پھیلے رہ گئے ہاتھ
اتنا پسینہ سوکھا، جسم کا ڈھانچا سوکھ گیا

خوابوں کی کالی آندھی میں کھو گئی جاگتی آنکھ
پھر جو آنکھ ملی تو نور کا سوتا سوکھ گیا

بھول سبھی سے ہو جاتی ہے یارو چھوڑو بھی
گھر سے باہر نکلو اب تو غُصّہ سوکھ گیا

ایسی آب و ہوا میں باقرؔ کون لگائے باغ
پھلنے کا موسم آیا تو پودا سوکھ گیا

اب کے سرسوں ہی پھولی نہ ٹیسو کھلے
کیسے یادوں کی کلیوں کی خوشبو کھلے

شام کے سب ستارے لرزنے لگے
جب شفق رنگ آنکھوں میں آنسو کھلے

درد چمکا کوئی شب کی پہنائی میں
جیسے تاریک گلشن میں جگنو کھلے

یہ شبستاں ہمارا گلستاں بنے
اک طرف میں کھلوں اک طرف تُو کھلے

کھول موتی بھری آنکھ کی سیپیاں
مسکرا دے کہ ہونٹوں کا جادو کھلے

خوشبوؤں سے مرے جسم کو بھر دیا
تیری کیاری میں بھی کوئی گل رو کھلے

دھوپ گہنائے کبھی دن کا اندھیرا چمکے
وہ بھی دن آئے کہ دن میں مرا تارا چمکے

راگ بھیگے تو کہیں رات کی رانی مہکے
چاندنی چھلکے تو سویا ہوا چشمہ چمکے

جن پہ لٹکے ہوئے اک عمر بتا دی ہم نے
ان صلیبوں پہ ذرا کوئی مسیحا چمکے

میری آنکھوں کے اُجالے مرے من کے سورج
تو چمک جائے تو میرے لیے دنیا چمکے

چمپئی دھوپ کے ساگر میں نہائیں دونوں
تیری چاندی تو مرے جسم کا سونا چمکے

آنکھوں کا صحرا صدیوں کا پیاسا لگتا ہے
اکثر ہم کو دریا بھی قطرہ سا لگتا ہے
دن بھر سورج، شام سے تارے، رات کو اکثر چاند
میرے ہر ہر فعل پہ اک پہرہ سا لگتا ہے
خوابوں کی تصویر بنانے کی کوشش تو کی
سارا منظر لیکن اک دھوکا سا لگتا ہے
لوگ کوئی تصویر لیے پھرتے ہیں گلی گلی
ہم کو بھی وہ چہرہ کچھ دیکھا سا لگتا ہے
پھلجھڑیاں لے کر جب تیری یاد نکلتی ہے
دل کے گاؤں میں کرنوں کا میلا سا لگتا ہے
تجھ بن راتیں صدیوں سے بھی لمبی لگتی ہیں
جب تو پاس میں ہو تو دن کوندا سا لگتا ہے
ہر لمحہ خود غرضی اتنی بڑھتی جاتی ہے
اس دنیا کا وقت بہت تھوڑا سا لگتا ہے

شاعر بھی، حساس بھی ہیں اور نازک دل بھی ہیں
باقرؔ ہم کو ہر صدمہ پہلا سا لگتا ہے

باتیں کرتی رہیں آنکھیں کبھی جگنو بولے
وقت جب آیا جدائی کا تو آنسو بولے

سلسلہ تجھ سے تکلم کا کہاں ٹوٹتا ہے
تو نہ بولے تو ترے ہونٹوں کا جادو بولے

میرے چہرے سے چھلکتا ہے ترے پیار کا رنگ
میرے کپڑوں سے ترے جسم کی خوشبو بولے

رات جنگل میں گزرتی ہے تو جی چاہتا ہے
کوئی آسیب ملے یا کوئی جادو بولے

مذہب عدل سے اب پہلا سا انصاف نہ مانگ
اتنا رکھ دے کہ ترے حق میں ترازو بولے

اک گزرتا ہوا بادل ہی برس جائے تو کچھ
ندیاں جاگ اٹھیں مٹی کی خوشبو بولے

سوچ رہا ہوں کیسے دیکھوں اپنا کاروبار
میرے بابا چھوڑ گئے ہیں اپنے درد کا ہار

کوئی برتن، کوئی مورت یا کوئی بھگوان
چاک پہ مٹی رکھ کر بیٹھا سوچ رہا ہے کمہار

دونوں میرے اپنے گھر ہیں لیکن الگ الگ
دیکھوں کب تک ٹوٹتی ہے یہ بیچ کھڑی دیوار

سونے چاندی کے برتن ہیں اور یاقوت کی اینٹ
صدیوں پرانی تہذیبوں کے کیسے ہیں آثار

صدقہ ہاتھ میں لے کر پھرتے رہیے شہر بہ شہر
ایسا بھی کیا ملک کہ جس میں کوئی نہیں نادار

کیسے رُوپ ہیں جن کو دیکھ کے آنکھیں جلتی ہیں
کیسے بدن ہیں جن کو چھو کر بانہیں جلتی ہیں
پت جھڑ میں سوکھے پتوں کو جلتے دیکھا تھا
پھول رُتوں میں کب پیڑوں کی شاخیں جلتی ہیں
سورج کے انگارے کو الزام نہ دے دینا
شامیں آگ لگاتی ہیں تب راتیں جلتی ہیں
جس بستی کے باسی بے حس ہو جاتے ہیں وہاں
ساحل سے دو گام پرے بھی قناتیں جلتی ہیں
آگ برستے موسم سے ہی پاؤں نہیں جلتے
چھالوں کے انگاروں سے بھی راہیں جلتی ہیں
اپنے تیر اندازوں کو اتنا تو سمجھا دو
جلتے تیر اگر پھینکو تو کمانیں جلتی ہیں

مٹی چھوڑ کے مٹی کو الزام نہ دے مورکھ
بیٹوں سے کب پالنے والی مائیں جلتی ہیں

گھر سے نکلے تو یہ غم تھا بے گھر ہو گئے ہم
تیری بستی میں پہنچے تو پتھر ہو گئے ہم

ساری عمر دعا مانگی تھی ہم کو قلم مل جائے
دعا ہوئی پوری تو اک دن بے سر ہو گئے ہم

نگر نگر کی آگ میں جل کر کندن کیا ہوتے
آپ ہی اپنی مٹی کے سوداگر ہو گئے ہم

تو لہراتا بادل تھا تو ہم پیاسے صحرا
تو نے ندی کا رُوپ بھرا تو ساگر ہو گئے ہم

جس دن باقرؔ ہم نے خود میں اپنا رنگ بھرا
اس دن سے سب کی آنکھوں کے کنکر ہو گئے ہم

روشنی والے ہی ساتھی نہ اندھیرے والے
کتنے مظلوم ستارے ہیں سویرے والے

رات بھر کوئی نہ تھا گلیوں میں سناٹا تھا
صبح ہوتے ہی نکل آئے ہیں پھیرے والے

دے کے فانوس میرے ہاتھ میں پابند کیا
اور خود ہوگئے مصروف اندھیرے والے

چگ کے اُڑ جائیں گے تم دیکھتے رہ جاؤ گے
وہ کوئی اور پرندے ہیں بسیرے والے

کیسی بستی ہے اُجالے میں بھی ڈر لگتا ہے
کام پہ پھر بھی نکل جاتے ہیں ڈیرے والے

کُنبہ چھوڑا بستی چھوڑی جنگل ہو گئے ہم
جاناں! تیرے پیار میں کیسے پاگل ہو گئے ہم

ساری عمر سفر میں گزرے یہ بھی کوئی جینا
تیری نمو کی خاطر پھر بھی بادل ہو گئے ہم

جاتے وقت کے غم میں روتے رہ گئے سارے لوگ
بھاگتے لمحوں کے پیروں کی چھاگل ہو گئے ہم

کیسے کیسے جتن سے تیرا رُوپ سجایا ہے
مہندی ہو گئے، افشاں ہو گئے، کاجل ہو گئے ہم

madlib.org

بہروں کی محفل میں راگ سناتے کیا
شرمندہ لوگوں کو پھر شرماتے کیا

دھوپ کے پیچھے بھاگے لیکن اِک حد تک
آنکھوں دیکھتے کھائی میں گر جاتے کیا

مٹی ڈھونڈتے ڈھونڈتے پودا سوکھ گیا
شوریدہ بنجر میں پھول اُگاتے کیا

برسوں تازہ حرف کوئی اترا ہی نہیں
ڈہرائے حرفوں کو ہی ڈہراتے کیا

جن کے ہاتھوں سے سدا زخم گراں بار آئے
پھول پہنے ہوئے اکثر وہی کردار آئے

آخرش بِک گئی وہ جنس جو بِکنے کی نہ تھی
صبح سے شام تلک اتنے خریدار آئے

میں کسی بولتے سورج کا تمنائی ہوں
گنگ تارے تو مرے در پہ کئی بار آئے

گر ہوا ہو تو دبی آگ بھڑک اُٹھتی ہے
درد بڑھتا رہا جتنے مرے غم خوار آئے

موسم آئے گا تو ہر بیل چڑھے گی باقرؔ
خواہ محراب ملے یا کوئی دیوار آئے

ڈھونڈتے تہہ میں ساگر کی موتی سبھی لے کے پھرتے رہے کانچ کی کشتیاں
ہم نے دیکھا کہ ساحل پہ بکھری رہیں مدتوں کتنی موتی بھری سیپیاں

ہولی کھیلی گئی ہے کہیں خون سے بھوک دیوی پہ کچھ لوگ وارے گئے
بت بنے سارے بھگوان بیٹھے رہے اور پجاری بجاتے رہے گھنٹیاں

کتنے سورج اُٹھے، چاند کتنے ڈھلے خلقتِ شہر پھر بھی بھٹکتی رہی
راستہ کیا مسافر کو دکھلائے گی خود اندھیرے میں بھٹکی ہوئی کہکشاں

پیڑ کاٹے گئے، پھول روندے گئے، بہتے دریاؤں پر بند باندھے گئے
جانے کتنے بسیرے اُجاڑے گئے تب بسائی گئی ہیں نئی بستیاں

ہوگئی مات اس بار طوفان کو، اب کے سیلاب بھی ہاتھ خالی گیا
لوگ کھیتوں سے فصلیں اُٹھا لے گئے بادلوں میں تڑپتی رہیں بجلیاں

مشرق مغرب کے جوئندہ ہم ہی تو ہیں
اُڑنے کا شوقین پرندہ، ہم ہی تو ہیں

سوچ انوکھی، طرز نرالی، حرف نئے
زندوں کی بستی میں زندہ ہم ہی تو ہیں

حرکت میں ہے دنیا لیکن پتھر ہے
پتھر کے اندر رقصندہ ہم ہی تو ہیں

دنیا، سورج، چاند ستارے سب بے جان
اے مالک! تیرے کارندہ ہم ہی تو ہیں

جنت میں اک نافرمانی ہم سے ہوئی
اپنے کیے پر خود شرمندہ ہم ہی تو ہیں

جسموں کی زردی پر کتنا روتے ہیں
ظالم خوں آشام درندہ ہم ہی تو ہیں

کبھی جو ذہن کے پردے پہ تھا گماں کی طرح
وہ اب وجود میں ضم ہوگیا ہے جاں کی طرح

مرے وجود کے پردوں پہ کھل اُٹھا ترا رنگ
تو مثلِ قوسِ قزح ہے، میں آسماں کی طرح

کبھی کبھی ہمیں طوفاں میں جھونک دیتی ہے
وہ یاد جس کو اٹھائے ہیں بادباں کی طرح

وہ دشت دشت بھٹکتا ہے بن کے موجِ بہار
ہمیں تو جب بھی ملا موسمِ خزاں کی طرح

ہجومِ کفر سے اُٹھیں گے حق پرست بہت
بلند ہو کے تو دیکھے کوئی اذاں کی طرح

ایسا بھی کیا شہر کہ جس میں کوئی نہیں انسان
دونوں طرف بازار سجے ہیں اور سڑک سنسان
تو ہی بھیج کوئی چنگاری اے پیارے سورج
چاروں سمت لگے ہیں اونچے نفرت کے کھلیان
آنکھ بھی پتھر دل بھی پتھر، سارا بدن پتھر
آنکھیں کھول پجاری دیکھ اپنے دیوتا کی شان
نیچے گھنے جنگل ہیں اور جنگل میں جال بہت
تیرے پنکھ سلامت پنچھی اونچی رہے اُڑان
گھٹنوں گھٹنوں برف پڑی ہے اس پر تیز ہوا
کب تک بے رونق رکھو گے گھر کے آتش دان
کبھی تو یہ خواہش تھی بہتے رنگوں میں کھو جائیں
اب ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں خود ہی اپنی پہچان

سُن مُن کرنے لگتا ہے ہر سویا سرد بدن
ٹھنڈی رُت کے سورج تیری پیلی دھوپ مہان

پڑتیں نہیں کیوں مجھ پہ حیات آفریں کرنیں
ہے سایہ فگن کون مرے سر پہ شجر سا

جسم کی تہہ میں چھپے رنگ کے جوہر نکال
موسمِ گل آگیا اب تو نئے پر نکال

نوح کی اولاد دیکھ آگ لگی ہے تمام
اشک نہیں آنکھ سے کوئی سمندر نکال

کوئی بھی لاغر نہیں کوئی تناور نہیں
ذہن کے دل میں گڑے خوف کے خنجر نکال

کرب سہا ہے عجیب مدتوں تخلیق کا
سیپ کو اعزاز دے سیپ سے گوہر نکال

آئے ہیں کچھ سرپھرے کانچ کے پیکر لیے
خلقتِ شہر اماں جھولی سے پتھر نکال

کچھ تو دکھا باغباں معجزہ ہائے نمو
بیج میں سوئے ہوئے پیڑ تناور نکال

کب کوئی عقدہ کھلے کوئی کرشمہ جاگے
تیری سوئی ہوئی آنکھوں میں سویرا جاگے

ایک مدت سے کوئی پوچھ رہا ہے ہم سے
آدمی ایک سحر کے لیے کتنا جاگے

ضائع کرتے رہے یوں روشنیِ جاں جیسے
رات بھر شمع جلائے کوئی اندھا جاگے

سارا دن پہرہ دیں سورج کی مسلط کرنیں
رات بھر سوئے ہوئے شہر میں کہرا جاگے

زندگی تازہ ہواؤں سے عبارت ہے تو پھر
سارا گھر خواب میں ہو پھر بھی دریچہ جاگے

اک روز جو یونہی ذکر چلا کچھ پھولوں کا کچھ خوابوں کا
مت پوچھیے کتنا یاد آیا وہ اپنا دیس گلابوں کا

کل صبح کو سورج چمکے گا، کل رات کو موتی برسیں گے
کتنے دن رہنے والا ہے یہ اونچا محل حبابوں کا

تب سوکھے بیج ہرے ہوں گے تب سوئی کونپل جاگے گی
جب مٹی کو مل جائے گا کچھ تازہ خون عقابوں کا

جب رنگ کے بادل بکھریں گے، جب ٹھنڈا سورج نکلے گا
تب دھیرے دھیرے اُترے گا یہ نشّہ سرخ شرابوں کا

یارو یہ سرِ علم و ہنر کوئی مِلک نہیں جاگیر نہیں
تم وارث تھے تم بھول گئے کیوں سارا علم کتابوں کا

یہ شہر اُجالے میں باقرؔ چہروں کا عجائب خانہ لگے
اور شب کے اندھیرے میں جیسے صحرا رنگین سرابوں کا

ہم اُٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ خواب دیکھتے ہیں
زمیں پہ حدِ نظر تک گلاب دیکھتے ہیں

یہ اپنا ذوقِ طلسمِ نظر ہے جس کے طفیل
سیاہ راتوں میں بھی آفتاب دیکھتے ہیں

کڑکتی دھوپ میں اُٹھتا ہے ہمتوں کا خمیر
وہ کم نظر ہیں جو ہر دم سحاب دیکھتے ہیں

سمندروں پہ حکومت ہمارا آئیں ہے
وہ ہم قبیلہ نہیں جو سراب دیکھتے ہیں

maablib.org

مُٹھی بھر تارے

پہلی اشاعت : دسمبر ۱۹۹۱ء

maablib.org

فیروزہ کے نام

جو میرا جزوِ بدن ہوگئی نمک کی طرح

ترتیب

maablib.org

بیساکھیاں... ارے توبہ

سیّد عاشور کاظمی

بیساکھیوں کے سہارے چلنے کا دستور بہت پرانا ہے۔

پہلے پہل جو بیساکھیاں بنائی گئیں وہ لکڑی کی تھیں۔ پھر لکڑی کی بیساکھیوں پر المونیم چڑھایا جانے لگا اور رفتہ رفتہ بات لوہے تک پہنچی۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ تبدیلی آئی کہ اب بیساکھیاں حرف ولفظ کی بھی بن رہی ہیں۔

بالغ لوگوں کو سہارا دینے کے لیے جو چیز بنائی گئی ہے، اُسے بیساکھی کہا جاتا ہے اور بچوں کو پاؤں پاؤں چلنا سکھانے کے لیے جو کھلونا نما شے ہوتی ہے، اسے بے بی واکر کہتے ہیں۔ بیساکھیوں کی لمبائی، استعمال کرنے والے کے قد سے مطابقت رکھتی ہے لیکن ادب میں بہت چھوٹے چھوٹے بچوں کو بڑی بڑی بیساکھیاں دے دی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ ادبی نابالغ ان قدآور بیساکھیوں پر یوں لٹکے نظر آتے ہیں جیسے مصلوب ہوگئے ہیں۔

گزرے زمانوں میں معذوروں کو، محتاجوں کو اور ضرورت مندوں کو علاج کرنے والے اداروں کی طرف سے بیساکھیاں فراہم کی جاتی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے یہ رواج ہوا کہ اساتذہ یعنی استاد شاعر اپنے شاگردوں کو عارضی طور پر بیساکھیاں فراہم کرتے تھے تاکہ شاگرد اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکے اور کچھ دنوں بعد بیساکھیوں کا محتاج نہ

رہے۔ ان بیساکھیوں کا معاوضہ محض استاد کی خدمت اور اظہارِ سعادت مندی تک محدود ہوتا تھا۔ لیکن یہ بیساکھیاں صرف ایسے شاگردوں کو دی جاتی تھیں جن کے متعلق استاد کو یقین ہوتا تھا کہ انھیں عارضی سہارے کی ضرورت ہے اور وہ جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دورِ حاضر میں ہر ملک اور ہر قوم افراطِ زر کا شکار اور کم و بیش ہر معاشرہ Consumerism سے دوچار ہے۔ چنانچہ supply and demand کے قانون کے تحت بیساکھیاں مہنگی ہوگئی ہیں... پھر آج کے انسان میں جذبۂ حرص و ہوا بھی اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ضرورت مند ایک یا دو بیساکھیوں پر قناعت کے بجائے ہر رنگ اور ہر ملک کی بیساکھیاں چاہتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ الفاظ کی بیساکھیاں فراہم کرنے کی دکانیں کھل گئی ہیں جہاں ریڈی میڈ بیساکھیاں ملتی ہیں... ضرورت مند کو صرف اپنا نام بتانا پڑتا ہے، قامت بتانے کی ضرورت نہیں... اور بیساکھیاں فراہم کرنے والے قد آور بیساکھیاں لے کر ضرورت مند کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں آرڈر پلیس کرنے والے کو یعنی صارف کو بیساکھیوں کی قیمت کے علاوہ کرایۂ آمد و رفت بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔

حروف و الفاظ کی بیساکھیوں کا ضمیر سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ جب تک ضمیر قابلِ فروخت شے نہیں تھا، بیساکھیوں سے اس کا رشتہ کچھ اور قسم کا تھا۔ آج کل ضمیر اور بیساکھیاں دونوں اشیائے خرید و فروخت میں شامل ہیں، لہٰذا دونوں میں قیمت اور زر و مال کا رشتہ ہے۔ اسی لیے تو ادبی نابالغ شاعروں کو میرؔ و غالبؔ سے زیادہ اور نثر لکھنے کی کوشش کرنے والوں کو محمد حسین آزاد کا استاد قرار دیا جاتا ہے اور فریقین میں سے کسی کے ضمیر کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ اگلے وقتوں میں الفاظ کی حرمت کا بھی پاس ہوتا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ضمیر زندہ ہوتے تھے۔ آج کل ضمیر کے علاوہ حرمتِ لفظ بھی کم یاب ہے۔ میڈ ٹو آرڈر (made to order) چیزوں کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔ ہر شے ریڈی میڈ (ready made) آسانی سے دستیاب ہے... بیساکھیاں بھی... لہٰذا کسے

فرصت ہے کہ حرمتِ لفظ کے چکر میں پڑے۔ دروغ برگردنِ راوی، کینیڈا کی ایک اطلاع کے مطابق اب تو کچھ بیساکھیاں فروخت کرنے والے مستقل بلکہ مسلسل ضرورت مندوں کے وظیفہ خوار یا تنخواہ دار ہو گئے ہیں (نہیں معلوم ان دونوں لفظوں میں کون سا لفظ زیادہ محترم ہے جو اظہار کے لیے استعمال کروں)۔ اس خبر پر پریشان ہوکر سوچا تو نجانے کیوں خیال آیا کہ شاید... برطانیہ میں بھی... اللہ معاف کرے دل میں کیسے کیسے شیطانی وسوسے آتے ہیں۔ خدا کرے یہ خبر غلط ہو۔

سننے میں آیا ہے کہ کسی استاد نے ایک شاگرد کی اصلاح کی اور کیوں کہ مشاعرے کا وقت قریب تھا، اس لیے شاگرد کو غزل کی ریہرسل (مشق) نہ کرا سکے۔ شاگردِ روشن ضمیر نے اسٹیج پر جاکر غزل پڑھی تو چتون کو چون پڑھا، استاد کھنکارے۔ شاگرد نے ذرا سنبھل کر پھر چون پڑھا، استاد پھر کھنکارے تو شاگرد نے کہا، استاد آپ کتنے ہی زور سے کھنکاریں مگر یہاں آپ نے "چون" ہی لکھا ہے۔

یہ شاید اس زمانے کا واقعہ ہو جب اساتذہ شاگردوں کے کردار کی تعمیر اور فن کی تکمیل کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ استاد اور شاگرد میں ایک رشتہ استوار ہوا کرتا تھا۔ آج کل سارے رشتوں کا حصول پیسے کے ذریعے ممکن ہے۔ لہٰذا بیساکھی فراہم کنندگان کی یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ خریداروں کی تربیت بھی کریں... کمپیوٹر فروخت کرنے والے کمپیوٹر کے ساتھ ایک Mannual دیتے ہیں۔ جو لوگ کمپیوٹر کے اہل ہوتے ہیں، وہ اس کے سہارے اپنا کام کرتے ہیں جو اہل نہیں ہوتے، وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ریڈی میڈ بیساکھی فراہم کرنے کی ایک دو مثالیں ایسی بھی دیکھنے میں آئیں کہ شاعر کی کچھ غزلوں کے حوالے سے اسے فراقؔ و فیضؔ کا ہم پلہ شاعر ثابت کرنے کی کوشش کے بعد جب کتاب چھپی تو وہ غزلیں ہی دیوان میں نہ تھیں۔ اسی طرح کتاب شائع ہوئی نظموں کی اور بیساکھی یا بیساکھیاں غزل گوئی کا قصیدہ پڑھتی آئیں۔ بیساکھیاں فراہم کرنے والے تاجروں میں اب مقابلہ اتنا شدید ہوگیا ہے کہ اب کسی کو شاعر یا ادیب بننے کے لیے خود ٹوٹی پھوٹی تخلیق کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ ان تاجروں کو اپنا نام

اور اپنا ارادہ بتا دیجیے۔ ایک سے زیادہ لوگ تخلیق شدہ مواد بیساکھیوں کے ساتھ لے کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

بیساکھیوں کے ذکر سے یہ مراد قطعی نہیں کہ کتابوں پر جو دیباچے یا پیش لفظ لکھے جاتے ہیں، وہ سارے کے سارے بیساکھیاں ہوتے ہیں۔ کتابوں پر دیباچے یا پیش لفظ لکھنے کا رواج قدیم بھی ہے اور مستحسن بھی لیکن حیرت وہاں ہوتی ہے کہ ایک صحیح اور genuine لکھنے والے پر تعارف، پیش لفظ یا دیباچہ لکھنے کی مخلصانہ درخواست تو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہے اور ادبی نابالغوں کو حقیقی لکھنے والوں پر فوقیت دلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کتابوں پر دیباچوں کا رواج اس لیے مستحسن ہے کہ بالغ نظر ناقدین کتاب میں شامل تخلیقات پر نظر ڈال کر اس کے محاسن پر روشنی ڈالیں تو اس سے لکھنے والے کا حوصلہ اور کتاب کا وقار بڑھتا ہے اور کم زوریوں کی نشان دہی (دیانت دارانہ تنقید، تنقیص نہیں) سے لکھنے والے کی رہنمائی ہوتی ہے۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ تجارت کے اس دور میں کچھ تاجروں نے مخلص اور بے لاگ تبصرہ یا نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کی آبرو کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اب آدمی کس کس کو بتائے کہ تجارت کے اس دور میں بھی پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر عقیل رضوی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، شوکت صدیقی اور ایسے بہت سے دانشور ہیں جو حرف کی تجارت نہیں کرتے۔ مذکورہ بالا اور انھیں کی طرح کے دوسرے صاحب الرائے اہلِ قلم کی عظمت اور احترام کے نام پر تجارت پیشہ بیساکھی فروش بزرگوں سے فی الحال بڑے ادب سے گزارش کی جاتی ہے کہ کم از کم مغرب میں آباد اردو کے قارئین کو ناسمجھ اور کور ذوق نہ سمجھیں۔ مغرب میں اردو کے قاری کے سامنے ان کے چہرے بھی بے نقاب ہیں اور ان کی بیساکھیوں کے خریداروں کے بھی۔ لہٰذا یہاں یہ دھاندلی اب زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ باقر نقوی ایسا قلندر اور بے باک شاعر ہے کہ جس نے کبھی بیساکھیوں کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ وہ معذور و محتاج نہیں اور باقر کو اس کا ادراک بھی ہے۔ انھیں راتوں رات شہرت کی تمنا بھی نہیں۔ حقیقی فن کار شہرت یا گم نامی کے دائروں

سے باہر رہ کر تخلیق کیا ہے۔ باقر کو تو اس کی فکر بھی نہیں ہوتی کہ ان کی کتاب کب چھپے گی، کیسے چھپے گی یا نہیں چھپے گی۔

''تازہ ہوا'' کے پیش لفظ میں لکھ چکا ہوں کہ پروفیسر عقیل رضوی ویٹو نہ کرتے تو نجانے اور کتنے دن مسودہ مجھے نہ ملتا۔ ''تازہ ہوا'' کے بعد یہی طے تھا کہ باقر جب کوئی غزل کہیں گے تو اس کی ایک نقل مجھے پہنچاتے رہیں گے۔ ''تازہ ہوا'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی لیکن اس میں ۱۹۸۵ء تک کا کلام شامل کیا تھا۔ باقر نقوی نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں؟ اب ''مٹھی بھر تارے'' میں جون 1991ء تک کا کلام شامل کر رہا ہوں تو باقر کو کوئی پریشانی نہیں۔ سچ پوچھیے تو انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی کون سی غزل کتاب میں آرہی ہے اور کون سی نہیں۔ یہ بے نیازی اسی میں آتی ہے جو خود کو محفوظ سمجھتا ہو۔ میں باقر کی شاعری پر ''تازہ ہوا'' میں اپنی رائے پیش کر چکا ہوں۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ باقر کا نقشِ ثانی اوّل سے بہتر ہے کہ نہیں۔ باقر کی شاعری میں ابتدا ہی سے زمانے کی روز بہ روز بدلتی صورتِ حال کا ادراک ملتا ہے، البتہ اب یہ لے تیز ہوگئی ہے۔ غزل کی کلاسیکی روایات سے مسلسل مربوط رہنے کے باوجود باقر الفاظ کو کلاسیکی معنوں کے علاوہ جدید معنی میں بھی اس چابک دستی سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی شاعری ایسا آئینہ بن جاتی ہے جس میں اس دور کے عالمی ماحول کی شکل نظر آجاتی ہے جس دور میں شعر کہا گیا ہو... دیکھیے دائیں اور بائیں بازو کی نعرے بازی کا تجزیہ:

سبز قلم کے ہاتھوں سے جنگل تحریر ہوئے
سرخ ہواؤں کے ہاتھوں صحرا تعمیر ہوئے

۱۹۸۸ء کے وسط میں امریکا بہادر کی فوج ظفر موج نے ایران کا ایک مسافر بردار طیارہ مار گرایا تھا جس میں سیکڑوں بے قصور مرد، عورتیں اور بچے لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اب ملاحظہ کیجیے باقر نقوی کی غزل کا مطلع، جو جولائی ۱۹۸۸ء میں کہی گئی:

محفوظ اب رہے نہ پرندے ہوا میں بھی
ہونے لگے شکار مسافر فضا میں بھی

ظلم و جبر، سیاسی استحصال، طاقت کا بے جا استعمال یا عدم توازن ایسے موضوعات ہیں کہ ان پر قلم نہ اٹھانا بے حسی یا بے غیرتی کے زمرے میں آتا ہے اور ان موضوعات پر لکھنے بیٹھیے تو (خصوصاً شاعری کے حوالے سے) غزل کی روایت کا دامن ہاتھ سے نکلتا دکھائی دیتا ہے اور بات نعرے بازی تک پہنچ جاتی ہے یا پھر سیاسی تناظر کا احاطہ نہیں ہو پاتا۔ باقر نقوی ان شعرا میں شامل ہیں جنھیں غزل میں بات کہنے کا سلیقہ اور ہنر آتا ہے، مثلاً گزشتہ دو برسوں (۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء) کے واقعات پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ حیران کن تبدیلیاں آئی ہیں۔ خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال نے تو سیاسی اقدار کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ دیکھیے باقر نقوی ان تلخ حقائق کو غزل کی زبان میں کیسے کہتے ہیں:

ہو رہے ہیں جمع میرے مہرباں اِک بار پھر
میری ہی بستی سے اٹھے گا دھواں اِک بار پھر

یہ مانا کچھ مکینوں کا چلن اچھا نہیں، لیکن
در و دیوار کو اس کی سزا اچھی نہیں لگتی

آزادی کی مانگ میں افشاں بن کے چمکے گی
خاکِ فلسطین و افریقہ، آج نہیں تو کل

اِک ہاتھ، ایک پاؤں کا پھر ہے مطالبہ
اب تک دیے تھے ہم نے جو تاوان کیا ہوئے

عجیب چال چلے اب کی بار بردہ فروش
غریب بک بھی گئے اور دام بھی نہ ملے

اس پر خاک کے بادل بھیجو، اس کو ہی گہناؤ
جس سورج سے کرنیں لے کر تم مہتاب ہوئے

اب دیکھنا یہ بھی ہے کہ یہ جھوٹے بادل
کب تک مرے سورج کو نکلنے نہیں دیتے

خشک موسم میں کم از کم بام و در محفوظ تھے
مہرباں بادل جہاں پہنچا وہاں بجلی گری

بیچ میں چاند اور سورج کے زمیں آئے گی تب
روشنی کس کی ہے اس کا فیصلہ ہوجائے گا

آزادی پر پابندیاں، افراد پر ہوں یا اقوام پر، باقر اس کے خلاف ہیں، اور اگر آزادیٔ فکر و نظر اور آزادیٔ اظہار و گفتار کے پرچم برداروں کی طرف سے کوئی قدغن لگے تو باقر چیخ پڑتے ہیں:

قہر ہوتا ہے سکوں بھی گر زباں بندی سے ہو
ہم کو ہے منظور فتنہ بھی لبِ آزاد کا

پڑ گیا قحط صداؤں کا تو اے دیدہ ورو!
بولتے کیوں نہیں، تم بھی تو سخنور ہو نا

اور سامراجی عزائم کے چہرے سے نقاب اٹھانے کا انداز دیکھیے:

کیوں نہ اِک شہر خلاؤں میں بسایا جائے
گل نیا جس کی زمینوں پہ کھلایا جائے

رہ سکے خلوتِ مخلوقِ زمیں پر بھی نظر
آسمانوں پہ بھی وہ جال بچھایا جائے

کر دیا جائے غلط راہ پہ سیاروں کو
چاند سورج کو کسی طرح لڑایا جائے

نعمتیں جتنی ہیں حاکم کے لیے وقف رہیں
شاہ جنت میں، جہنم میں رعایا جائے

باقر نقوی کو استعاروں کے برتنے کا سلیقہ آتا ہے۔ جب کہ بہت سے اہلِ قلم اس بارہ دری میں رستہ بھول جاتے ہیں۔ زیادہ پرانی بات نہیں کہ ہندوستان کے ایک پیشہ ور نقاد نے اردو شاعری اور کربلا کے استعارے کے حوالے سے ایک ''جوابیہ مضمون'' لکھا تھا جسے بعد میں کسی ضرورت مند کی درخواست پر کتابی شکل دے کر بیساکھی بنا دیا گیا۔ (لندن میں موصوف نے جب یہ مضمون پڑھا تو خاص طور پر اپنے میزبان کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا، دیکھیے میں نے اس مضمون میں ستائیس صفحات ان کے لیے لکھے ہیں)۔ اس اعلانِ مبارک سے میزبان کا پیسا وصول ہوا کہ نہیں، یہ تو وہ جانے جس پر یہ برا وقت آیا تھا، ہمیں تو صرف اتنا اندازہ ہوا کہ دانشور صاحب کربلا کے حوالہ جاتی استعمال اور استعاراتی استعمال کے مابین فرق سے واقف نہیں۔ اس لیے کہ جس کلامِ بلاغت نظام پر توصیف کا حقِ نمک ادا کیا گیا تھا اُس میں زیادہ تر کربلا کا حوالہ جاتی استعمال تھا، استعاراتی نہیں۔ میں اہلِ نظر کے توسل سے موصوف کی خدمت میں باقر نقوی کا صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں جس میں کربلا کا استعارہ ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ موصوف کی دکان پر کوئی نیا گاہک اسی قسم کا ''جواب مضمون'' لینے آئے تو نام کی تبدیلی کے ساتھ استعاراتی استعمال کی وضاحت بھی فرما دیں، انھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ یوں بھی بڑے لوگوں کو کون کچھ کہہ سکتا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کچھ نہ بگاڑ سکے تو ہم

کیا۔ بہر حال باقر کے اشعار دیکھیے:

ویران پشت زین ہے باگیں کٹی ہوئی
جاتا کدھر ہے وقت کا رہوار دیکھنا

استعاروں کے برتنے کی ہنرمندی ملاحظہ کیجیے:

نہروں پہ قبضہ کرنے والے بے نام رہے
پیاسے ہونٹوں سے ٹھنڈا پانی منسوب ہوا

نہ پوچھ کیسے ہم اس شہر کربلا میں رہے
کہ ایک زہر بجھا تیر ہر کمان میں تھا

ہم نے خود دیکھا کہ چڑیوں نے بھی تنکوں کے عوض
دھات کے ٹکڑے چنے ہیں آشیانوں کے لیے

بن گئیں شوقِ سفر میں اتنی بھاری کشتیاں
زورِ طوفان چاہیے اب بادبانوں کے لیے

ہم نے اِک اخبار میں دیکھا انوکھا اشتہار
ہے ضرورت چند سانپوں کی خزانوں کے لیے

اور ایک ایسا شعر ملاحظہ فرمائیے جو بادی النظر میں خوب صورت شعر ہے لیکن اگر اسے واقعات کا استعارہ سمجھیں تو اور بھی خوب صورت ہو جاتا ہے:

محلوں کے گُن گانے والا ہی محبوب ہوا
جس نے اپنا راگ الاپا وہ مصلوب ہوا

اپنی مٹی سے وفا اور اپنے وطن سے لگاؤ باقر کی ذات کا حصہ ہے۔ اسی لیے

وطن کے حالات پر باقر کبھی رنجیدہ ہوتے ہیں، کبھی شاکی، کبھی تلخ اور کبھی سہانے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن ہر کیفیت کا لب و لہجہ غزل کا ہوتا ہے:

اپنے طاق پہ ہم اوروں کے دیے جلائیں گے کب تک
دل کے لکھے گیت کسی کی تال پہ گائیں گے کب تک

کم زور تھے ضرور مگر آبرو تو تھی
رسوا ہمیں بہت تری امداد نے کیا

یہ کیسا شہر ہے کہ جو آباد ہے مگر
دیکھوں بلندیوں سے تو صحرا دکھائی دے

آیا ہے عجب وقت کہ ماں باپ گھروں سے
بچوں کو کسی وقت نکلنے نہیں دیتے

کہہ رہے ہیں حادثوں سے کھیلتے بچوں کے دل
بچ گئے ہم تب ہماری نوجوانی دیکھنا

رات اِک وسوسۂ بے خبری میں گزرے
صبح ہوجائے تو اخبار سے ڈر لگتا ہے

رکھتا تھا کبھی خوفِ ستم بند گھروں میں
اب کے تو ہم انصاف کے ڈر سے نہیں نکلے

حق بات نہ کہنے کی سزا کچھ بھی نہیں ہے
حق بات کہو، اس کی سزا ہے مرے گھر میں

سب ہوا پیا ہوئے تو کیا کریں گی کشتیاں
ڈوبنے کو کیا اکیلا ناخدا رہ جائے گا

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ باقر کے ہاں گھر وطن بھی ہے اور دنیا بھی۔ مخلوقِ خدا سے محبت کرنے والا شاعر کائنات کو بھی اپنا گھر سمجھتا ہے اور جہاں بھی حق بات کہنے کی سزا ملتی ہے، اسے محسوس ہوتا ہے، یہ المیہ اُس کے گھر میں ہوا ہے۔ اسی لیے باقر ساری دنیا کے جبر پسندوں کے خلاف ہیں اور مصلحت پسندوں سے ناخوش۔

بجلیاں کوندتی پھرتی ہیں دماغوں میں تو پھر
سانحہ ہے کہ نہیں خون کا ٹھنڈا ہونا

پھول کم ہوتے ہیں آتے ہیں زیادہ پتھر
کتنا مخدوش ہے اس دور میں اونچا ہونا

لوگ ظلمت پہ ہی ایمان نہ لے آئیں کہیں
کوئی خورشید سے کہہ دو کہ خدارا نکلے

کہہ دوں تو ٹوٹ جائے گا الفاظ کا بھرم
لکھا ہوا کچھ اور کہانی کچھ اور ہے

آسمانوں پہ کوئی ان کا بھی حق ہے کہ نہیں
وہ پرندے کہ جو پیدا ہوئے زندانوں میں

کائنات کو اپنا گھر اور اپنے گھر کو کائنات سمجھنے والا شاعر ہی ایسا شعر کہہ سکتا ہے جو آپ بیتی بھی ہو اور جگ بیتی بھی:

عروسِ ماہ بھی سو جائے مہر بھی نہ اٹھے
خدا کرے کہ نہ ایسی سحر کسی کو ملے

وہ اپنے اس گھر کی بقا کے لیے مزید قربانیوں کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں:

ہم ہی ہمیشہ کام آئے ہیں، آج بھی حاضر ہیں
پھول اگر بچ جائیں کانٹوں کی قربانی سے

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں آباد اہلِ قلم اپنے گرد و پیش کے مشاہدات کو نہیں لکھتے، اُن کی نذر باقر نقوی کے چند اشعار۔ ہماری نئی نسل کو درپیش مسائل کی جھلک دیکھیے:

لہجہ و تہذیب ماضی کے ورق رہ جائیں گے
صرف شجرے تک نشاں رہ جائے گا اجداد کا

عید پہ کارڈ ملیں، موت پہ پھول آتے ہیں
بوڑھے ماں باپ سے رہ جاتا ہے ناتا کیسا

تمام عمر گزر جائے جس زمیں پہ وہیں
ہماری نسل کو اذنِ قیام بھی نہ ملے

جنوب اور مشرق یعنی جنوبی ایشیا اور مغرب میں اقتصادی تفاوت کی نشان دہی غزل کی زبان میں دیکھیے:

پورب دکھن، ناگ پھنی اور ریتیلا میدان
ہم جس بستی میں ہیں اس میں گھر گھر پھول کھلے

اور بنی نوع انسان کے دوست، انسانی دکھوں پر کڑھنے والے شاعر کو جب کسی جگہ سے

متضاد خبریں ملتی ہیں تو غزل ایک نیا روپ دھار لیتی ہے:

پوچھ رہا ہے مجھ سے یہ میرے اندر کا وحشی
رام کی لیلا دیکھوں یا سجدے میں بابر دیکھوں

شام سویرے پاٹ اہنسا کے سنتا ہوں پھر بھی
کالی مائی کے ہاتھوں میں، روز نیا سر دیکھوں

یہ تضاد اسے دکھی کر دیتا ہے، یہ خون خرابہ اسے پریشان کرتا ہے۔ وہ تو امن کا شاعر ہے، سلامتی کا نقیب ہے، اسی لیے تو کہتا ہے:

زہل پر اٹھنے والی تلواریں مردہ باد
گھاؤ کی جے، مرہم کی جے، گم نام دوا کی جے
آپس میں لڑنے والی سینائیں مردہ باد
چکی میں پسنے والی بھوکی جنتا کی جے
کھلیانوں میں آگ لگانے والے مردہ باد
ہل کی جے، ہرواہ کی جے، گرتے میگھا کی جے
باقرؔ آؤ سب مل کر جگ میں آگ لگائیں
سچ کی جے، نیکی کی جے، جنتا سیوا کی جے

میں نے ہمیشہ اردو کے قارئین کو صاحب الرائے سمجھا ہے اور اپنی رائے کا اظہار جب بھی کیا ہے تو اس احترام اور احساس کے ساتھ کیا ہے کہ ہمارے قاری ادب کی پرکھ رکھتے ہیں۔ میں نے ''مٹھی بھر تارے'' سے باقر کی رومانی شاعری کے اشعار یہاں نقل نہیں کیے ہیں، حالاں کہ ان کی رومانی شاعری میں بھی ان کے تیور الگ ہیں۔ مثلاً:

چاند کے بعد وہ چہرہ نظر آیا جیسے
ایک ہی رات میں مہتاب دوبارہ نکلے

تاہم جو اشعار بھی یہاں نقل کیے گئے ہیں، اگر ہمارے قارئین ان کم و بیش پچاس اشعار کو اچھے اور زندہ رہنے والے اشعار کی سند عطا کر دیتے ہیں تو بات تو ثابت ہوگئی نا کہ باقر کے ہاں شعور بھی ہے، اسلوب بھی اور ارتقا بھی۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شاعروں کے ایک مجموعے کے بعد جب دوسرا آتا ہے تو اس میں جگالی زیادہ ہوتی ہے اور نیا پن کم۔ خیالِ خاطرِ احباب ہے ورنہ کئی نام ایسے گنوا سکتا ہوں کہ پہلے دیوان سے لے کر تیسرے چوتھے یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصے تک شعرائے کرام جگالی میں مصروف رہے ہیں۔ لیکن باقر کا ''تازہ ہوا'' سے ''مٹھی بھر تارے'' تک کا سفر ارتقا کا سفر ہے۔ میرے قارئین اگر میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے متفق ہیں تو آیئے مل کر کہیں:

دھن کی پجاری اس دنیا میں باقرؔ ہی کی بات نہیں
جو بھی سچی باتیں لکھے، اس لیکھک کی جے

❁

پڑ گیا قحط صداؤں کا تو اے دیدہ ورو
بولتے کیوں نہیں تم بھی تو سخن ور ہو نا

بن میں بہے گی پھر سے پُروا، آج نہیں تو کل
پانی ہوگا دریا دریا، آج نہیں تو کل

آزادی کی مانگ میں افشاں بن کر چمکے گی
خاکِ فلسطین و افریقا آج نہیں تو کل

کشتِ ستم پر قرض رہے گا یہ معصوم لہو
پھول بنے گا قطرہ قطرہ آج نہیں تو کل

کب تک چاند ستارے یوں گہنائے جائیں گے
روشن ہوگا رستا رستا آج نہیں تو کل

کب تک رہ سکتے ہیں یک جا ظالم اور مظلوم
کٹ جائے گا ظلم کا رشتہ آج نہیں تو کل

بستی بستی ہوگا اِک دن جشن چراغوں کا
پھول کھلیں گے صحرا صحرا آج نہیں تو کل

خوشبو صبا کا حق ہے اثاثہ کسی کا ہو
پانی ہے ساری خلق کا دریا کسی کا ہو

شبنم سا ہو سلوک، صبا سا ہو التفات
کھلتا ہوا گلاب ہے بچہ کسی کا ہو

ایک ایک اینٹ میں ہیں ہزاروں روایتیں
گھر تو ہمارے جد کا ہے تالا کسی کا ہو

ہم ساری رات محوِ دعائے سحر رہے
سورج ہمارا حق ہے ستارہ کسی کا ہو

اس سے غرض نہیں کہ وہ جگنو کہ چاند ہے
مقصود روشنی ہے اُجالا کسی کا ہو

وہ محسنِؔ عظیم ہو یا ہو گدائے شہر
ہوتے ہیں جمع لوگ تماشا کسی کا ہو

بھڑکتی رہتی ہے سورج کی آگ سینوں میں
جڑے ہیں چاند ستارے مگر جبینوں میں

ہم آسمان پہ کچھ ابرِ تازہ دَم لے آئیں
تم اپنے پھول لگاؤ نئی زمینوں میں

وہ رائیگاں نہ کرے مرہم دعا اپنا
کہ زخم بھرتے نہیں صبر کے مہینوں میں

تری بڑائی کے باوصف بھی نہیں تجھ میں
ہیں جتنے رنگ سمندر ترے دفینوں میں

اُترنے والا ہے گویا عذاب تنہائی
مکان خود ہی سمٹنے لگے مکینوں میں

یہ آندھیوں کا زمانہ تو ہے مگر اِک دن
ہوا پناہ گزیں ہوگی آبگینوں میں

وہ زخم کیا کہ جو دل ہی میں مندمل ہوجائیں
وہ داغ کیا نظر آجائیں جو مشینوں میں

اچھا ہے کہ وہ ریشمی گھر سے نہیں نکلے
کچھ کام ہمارے بھی سفر سے نہیں نکلے

مدت ہوئی اُجڑا تھا بسیرا پہ ابھی تک
کانٹے مرے ٹوٹے ہوئے پَر سے نہیں نکلے

آنچ آتی تھی ایسی کہ پگھلتا تھا مرا جسم
کیا شعلے تھے جو دیدۂ تر سے نہیں نکلے

رکھتا تھا کبھی خوفِ ستم بند گھروں میں
ہم اب کے تو انصاف کے ڈر سے نہیں نکلے

اُجڑا تو کھلا شہر پہ قبضہ تھا بتوں کا
دو چار صنم ہی کسی گھر سے نہیں نکلے

جن کے لیے سینچا مرے پیاروں نے لہو سے
وہ پھول ابھی تک تو شجر سے نہیں نکلے

شہرت نہیں نصیب کہ رتبہ نہیں ملا
اس بے بضاعتی پہ بھی کیا کیا نہیں ملا

آئے اگر نہ دھوپ تو اُگتا نہیں ہے کچھ
کیجے خدا کا شکر کہ سایہ نہیں ملا

اُس وقت شہرِ قلب کا منظر تھا دیدنی
جس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں ملا

اے ریگِ تشنہ کام وہ قطرہ ہیں ہم جسے
بادل کی گود چھوڑ کے دریا نہیں ملا

گھر میں بھرے ہوں لاکھ جواہر تو کیا، اگر
مٹھی بھر اِک فقیر کو آٹا نہیں ملا

ہو رہے ہیں جمع میرے مہرباں اِک بار پھر
میری ہی بستی سے اُٹھے گا دھواں اِک بار پھر

اہلِ ایماں سجدہ فرما گاوِ زر کے سامنے
سانپ بنتی جا رہی ہیں رسیاں اِک بار پھر

مست کس گرداب میں ہے تیری موجِ آبرو
بن رہا ہے بند اے نہرِ رواں اِک بار پھر

سبز پتوں کو ترستی تھیں ابھی کچھ ٹہنیاں
آگئی ہے کس قدر جلدی خزاں اِک بار پھر

کیجیے پیدا گھروں میں کوئی آثارِ حیات
ورنہ چن دی جائیں گی سب کھڑکیاں اِک بار پھر

خشک باغیچوں کو پانی کی ضرورت تھی مگر
کتنی بھر لائے ہیں بادل بجلیاں اِک بار پھر

گل الگ پتے الگ تیرا شجر سب سے الگ
کیا تعجب ہے کہ آتے ہیں ثمر سب سے الگ

تیرے ماتھے کے نشاں کی منزلیں سب سے جدا
تیرے ہاتھوں کی لکیروں کا سفر سب سے الگ

اُس پرندے کو بھی پایا آسماں کی قید میں
جس کے بازو سب سے اچھے جس کے پَر سب سے الگ

کب تلک بچتے رہو گے دام سے تہذیب کے
کب تلک صحراؤں میں ہوگی بسر سب سے الگ

نام کیا ہے، کون ہے وہ، آپ خود پہچانیے
کس کا دل سب سے انوکھا کس کا سر سب سے الگ

محفوظ اب رہے نہ پرندے ہوا میں بھی
ہونے لگے شکار مسافر فضا میں بھی

نکلا سناں پہ باندھ کے وہ پرچمِ سفید
بارود رکھ دیا ہے پرِ فاختہ میں بھی

بہتا کبھی ہے امن کی خاطر بھی خونِ خلق
ہوتا ہے کچھ تو زہر کا عنصر دوا میں بھی

الطاف ہی نہیں ہیں فقط جرم کا علاج
ہوتے ہیں کچھ نجات کے پہلو سزا میں بھی

زر کی طلب ہے وہ بھی سخاوت کے نام پر
کرتے ہیں لوگ مکر خدا سے دعا میں بھی

گر لبِ آواز حرفوں سے خفا ہوجائے گا
یہ صداؤں کا سمندر بے صدا ہوجائے گا

کیا زمیں کی خاک سے بڑھ کر ہے گردِ کہکشاں
کیا بشر افلاک میں جاکر خدا ہوجائے گا

بیچ میں چاند اور سورج کے زمیں آئے گی تب
روشنی کس کی ہے اس کا فیصلہ ہوجائے گا

کیا خبر تھی دیکھ کر تیری مسیحائی کا رنگ
اور بھی کچھ زخم آنکھوں کا سوا ہوجائے گا

روشنی کے خواب دیکھوں اور اندھیرے میں رہوں
اس طرح کیا روشنی کا حق ادا ہوجائے گا

کیوں نہ اِک شہر خلاؤں میں بسایا جائے
گل نیا جس کی زمینوں میں کھلایا جائے

ہر عمارت پہ لگے جھوٹی انا کا پرچم
شاہراہوں کو ہواؤں سے سجایا جائے

رہ سکے خلوتِ مخلوقِ زمیں پر بھی نظر
آسمانوں میں بھی وہ جال بچھایا جائے

ہو کسی طرح ہواؤں میں خلل اندازی
بہتے دریاؤں کے پانی کو ستایا جائے

کر دیا جائے غلط راہ پہ سیاروں کو
چاند سورج کو کسی طرح لڑایا جائے

جن کے جلنے سے اُجالے کا رہے اندیشہ
غار میں ایسے چراغوں کو چھپایا جائے

ایسے انسان مشینوں سے بنائے جائیں
ذکر سے جن کے فرشتوں کو ڈرایا جائے

نعمتیں جتنی ہوں حاکم کے لیے وقف رہیں
شاہ جنت میں، جہنم میں رعایا جائے

تاکہ مل جائے شب و روز کے سجدوں سے نجات
دوسرا کوئی خدا ڈھونڈ کے لایا جائے

کیسے فتنے سے زمیں بھر گئی تیری، مالک
نیک مخلوق کہاں تیری خدایا جائے

maablib.org

کھنچنے لگی ہے نور کی تلوار دیکھنا
لوگو ہماری صبح کے آثار دیکھنا

ویران پشتِ زین ہے، باگیں کٹی ہوئی
جاتا کدھر ہے وقت کا رہوار دیکھنا

ہیں مہر و ماہ دوش پہ، دامن میں کہکشاں
اے اہلِ مصر میرا خریدار دیکھنا

کتنا بڑا ستم ہے کسی آنکھ کے لیے
اِک روشنی کے شہر کو مسمار دیکھنا

سب ہی سجائے بیٹھے ہیں دیوار و در بہت
لکھا ہے کیا مگر پسِ دیوار دیکھنا

جو کچھ نہ ہو سکا ہمیں اس کا تو غم نہیں
کیا کیا نہیں ہوا سرِ دربار دیکھنا

آنکھوں میں عزم ہاتھ میں اِک تیشۂ قلم
اب کوہ کن کے کام کے اَوزار دیکھنا

اِک عمر جس کو اہلِ علم سوچتے رہے
وہ کام کر گیا مرا سردار دیکھنا

یوں بھی کچھ خوب نہ تھا زینتِ صحرا ہونا
فخر کی بات ہے اب شہر میں رُسوا ہونا

وہ مناظر ہیں کہ ہوجاتی ہیں آنکھیں زخمی
اتنا آساں تو نہیں صرفِ تماشا ہونا

بجلیاں کوندتی پھرتی ہوں دماغوں میں تو پھر
سانحہ ہے کہ نہیں خون کا ٹھنڈا ہونا

جو بھی مخلوق ہوئی ہاتھ کے فن سے غافل
اس کا مقسوم ہوا ہاتھ کا چھوٹا ہونا

روح بیمار ہو، جینے کی تمنا بھی نہ ہو
کون اس کرب میں چاہے گا مسیحا ہونا

پھول کم ہوتے ہیں، آتے ہیں زیادہ پتھر
کتنا مخدوش ہے اِس دور میں اونچا ہونا

اہلِ تہذیب کو زیبا نہیں ہرگز باقرؔ
دھوپ کو دیکھ کے ساحل پہ برہنہ ہونا

عجب ساحل کا منظر ہوگیا ہے
پیالوں میں سمندر ہوگیا ہے

ہواؤں کے سمندر میں اتر جانے کو جی چاہے
اِدھر جانے کو جی چاہے اُدھر جانے کو جی چاہے

چمکتے راستے چل چل کے جب جلنے لگیں آنکھیں
تو اِک اندھی گلی سے بھی گزر جانے کو جی چاہے

بلاؤں کی عناں گیری کا جذبہ ہے کہ ہر لمحہ
جدھر سے بھاگتے ہوں سب، اُدھر جانے کو جی چاہے

معلق ہوگئے کیسے فریبِ لامکانی میں
نہ بازاروں کی خواہش ہے، نہ گھر جانے کو جی چاہے

بلندی ہو گئی ہے اتنی خالی، اتنی فرسودہ
کسی گہرائی میں پھر سے اُتر جانے کو جی چاہے

کبھی چاہوں زمیں میں رنگ بن کر جذب ہو جاتا
کبھی مانند خوش بو کے بکھر جانے کو جی چاہے

خداوندا فرشتوں کی بھی اب معراجِ خاکی ہو
ہمارا بھی کبھی افلاک پر جانے کو جی چاہے

موسموں نے بھی کبھی رنگ دکھایا اچھا
دھوپ لگنے لگی اچھی، کبھی سایا اچھا

پھول کو رنگ کی، خوش بو کی، دعا دی جائے
آؤ! اِک بار زمیں پھر سے سجا دی جائے

ابنِ آدم نے محبت کا ہنر سیکھ لیا
یہ خبر سارے فرشتوں کو سنا دی جائے

چاہنے والوں کو خانوں میں جو تقسیم کرے
ایسی شیشے کی بھی دیوار گرا دی جائے

جس کی گرمی سے پگھلنے لگے تنہائی کی برف
ایسی چنگاری کو تائیدِ ہوا دی جائے

جس کے پڑھنے سے کسی طرح قلم ہو بدنام
ایسی تحریر جہاں بھی ہو مٹا دی جائے

نفرتیں ایسے محبت میں بدل دی جائیں
جیسے بدرَو کوئی دریا میں ملا دی جائے

قہر ہو جس کے لیے اُس کے کینوں کا نفاق
ایسی بستی کو بھلا کیسی دعا دی جائے

ذہن سے محو ہوئے جاتے ہیں خوابوں کے چمن
کس خرابے میں ملا ہے ہمیں آرام ایسا

سکھ مندر کے اندر بکھرے دکھ کے پتھر دیکھوں
کھڑکی سے باہر جھانکوں تو خونیں منظر دیکھوں

ڈالی ڈالی اُگ آئے ہیں لمبے لمبے کانٹے
اپنے ہی پر زخمی ہوں تو کس کس کے پر دیکھوں

جاگتی آنکھیں جو کچھ دیکھیں وہ دیکھا نا جائے
کب تک دل کے بہلانے کو سپنے سندر دیکھوں

کہیں تو جلتی دھوپ میں دیکھوں چلتے پھرتے سائے
اور کہیں سیلاب میں بہتے برتن بستر دیکھوں

خون پسینہ ایک کیا تھا کیا میں نے اس دن کو
بلبل کو سہما سہما پھولوں کو ششدر دیکھوں

پوچھ رہا ہے مجھ سے یہ میرے اندر کا وحشی
رآم کی لیلا دیکھوں یا سجدے میں بآبر دیکھوں

شام سویرے پاٹھ اَہنسا کے سنتا ہوں پھر بھی
کالی مائی کے ہاتھوں میں روز نیا سر دیکھوں

وہ مٹی کو چھو لے تو مٹی سونا بن جائے
ڈرتے ڈرتے اِک دن میں بھی سونا چھو کر دیکھوں

چاند اور سورج کے پہیے ہوں کھینچے جس کو اوشا
سوچ رہا ہوں اِک دن ایسے رتھ پر چڑھ کر دیکھوں

maablib.org

دُور بھلا کر سکتے ہیں کب رات کے دکھ سارے
دامن بھر مہتاب کی کرنیں، مٹھی بھر تارے

ہم بھی کتنے پاگل تھے کیا دے کر کیا لے آئے
لَو دیتی کلیوں کے بدلے ٹھنڈے انگارے

دیکھو تو کوئی بات نہیں ہے سوچو تو سب کچھ
روز نئی اُٹھتی دیواریں، گرتے مینارے

رہتی ہے نقصان میں کونپل گھاٹے میں کلیاں
کوئی موسم جیتے یا کوئی موسم ہارے

رات ہوئی تو گلشن گلشن کیاری کیاری میں
جگنو بن کر پھیل گئے بجلی کے ہرکارے

کاری گر کا تیشہ جو کچھ چاہے وہ لکھ جائے
حرف بھلا کب چن پاتے ہیں کتبے بے چارے

بن بادل بھی ہوجاتی ہے خوش بو کی بارش
خود بھی چلنے لگتے ہیں رنگوں کے فوارے

سنگ زن بستی میں، طوفانی ہوا کے دشت میں
جس پہ کوئی پھول نہ آیا، وہ شجر اچھا رہا

سچ کسی روز کوئی خواب ہمارا نکلے
جیب سے چاند تو مٹھی سے ستارا نکلے

لوگ ظلمت ہی پہ ایمان نہ لے آئیں کہیں
کوئی خورشید سے کہہ دو کہ خدارا نکلے

ہم دفینے کو زمیں کھودیں تو نکلے پانی
وہ جو پانی کا کنواں کھودے تو پارہ نکلے

چاند کے بعد وہ چہرہ نظر آیا جیسے
ایک ہی رات میں مہتاب دوبارہ نکلے

آ، چمن میں بھی اُسے ڈھونڈنے چلتے ہیں صبا
کسی غنچے ہی سے شاید وہ دل آرا نکلے

یاد یوں آتے ہو، گردابِ غمِ دنیا میں
جس طرح بیچ سمندر میں کنارہ نکلے

منحصر آپ کی ہمت پہ ہے سب کچھ باقرؔ
سنگ کیا چیز ہے پانی سے شرارہ نکلے

چشمِ بے نور پہ رنگوں کا اثر کیا ہوگا
بند کانوں کے لیے تازہ خبر کیا ہوگی

کب تلک ترسیں گی آنکھیں آسمانوں کے لیے
اب چھتیں بنواؤ شیشے کی، مکانوں کے لیے

ہم نے خود دیکھا کہ چڑیوں نے بھی تنکوں کے عوض
دھات کے ٹکڑے چنے ہیں آشیانوں کے لیے

پھولنے پھلنے کے قابل ہوں جو پانی کے بغیر
ایسے پودے ڈھونڈنے ہوں گے چٹانوں کے لیے

بن گئیں شوقِ سفر میں کتنی بھاری کشتیاں
زورِ طوفاں چاہیے اِن بادبانوں کے لیے

آسماں کی وسعتیں غمگین ہیں اُن کے لیے
بیچ ڈالے پَر جنھوں نے چند دانوں کے لیے

گو زمیں کم پڑ گئی تھی پھر بھی اہلِ ذوق نے
ایک صحرا چھوڑ رکھا ہے دِوانوں کے لیے

سر ہے پتھر کا، نہ اپنا جسم ہے بے استخواں
ہم تو کچھ موزوں نہیں ہیں آستانوں کے لیے

بس توانا ہاتھ یا اچھی کمانیں ہی نہیں
تیر بھاری چاہییں اُونچے نشانوں کے لیے

آج کا گاہک اگر مجبور ہے اندھا نہیں
کتنا کھوٹا مال لاؤ گے دکانوں کے لیے

تذکرہ جن کا نئی نسلوں کو شرمندہ کرے
نام دے گا کون ایسی داستانوں کے لیے

ہم نے اِک اخبار میں دیکھا انوکھا اشتہار
ہے ضرورت چند سانپوں کی خزانوں کے لیے

طوفان سے بچاؤ کے سامان کیا ہوئے
سب سائباں کدھر گئے دالان کیا ہوئے

ساحل کی دھوپ اور لباسِ برہنگی
ہے کس کو ہوش جیب و گریبان کیا ہوئے

زندوں پہ بھی جھپٹنے لگے مردہ خور گدھ
رَستے تمام شہر کے سنسان کیا ہوئے

اِک ہاتھ، ایک پاؤں کا پھر ہے مطالبہ
اب تک دیے تھے ہم نے جو تاوان کیا ہوئے

ہر لحظہ ہے شریر ہوا ہے مقابلہ
کچھ گل ہمارے باغ کے مہمان کیا ہوئے

گودام ہوتے جاتے ہیں سارے خلا سے پُر
چوہے، ہمارے شہر کے دیوان کیا ہوئے

بادل کو بھی عذاب سمجھنے لگے ہیں لوگ
بارش سے چند روز پریشان کیا ہوئے

اس طرح اجر کرتے ہو ایمان کا طلب
احساں کیا خدا پہ، مسلمان کیا ہوئے

ہر کوئی چل پڑا ستم آباد کی طرف
لمبے سفر کے مرحلے آسان کیا ہوئے

کیا خوب، اپنے آپ کو شاعر سمجھ لیا
باقرؔ میاں بھی صاحبِ دیوان کیا ہوئے

maablib.org

پانی ہے، اُجالا ہے، ہوا ہے مرے گھر میں
ہر چیز کے ہوتے ہوئے کیا ہے مرے گھر میں

خوش بو کا طلب گار بنا پھرتا ہوں ورنہ
کہنے کو تو ہر پھول کھلا ہے مرے گھر میں

جو سامنے آئے، نظر آتا ہے برہنہ
ایسا بھی اِک آئینہ لگا ہے مرے گھر میں

سجدہ مرا کعبے کی طرف ہوتا ہے پھر بھی
اِک بت ہے کہ مدت سے سجا ہے مرے گھر میں

آئی ہو بلا اور یونہی لوٹ گئی ہو
ایسا بھی کسی روز ہوا ہے مرے گھر میں

حق بات نہ کہنے کی سزا کوئی نہیں ہے
حق بات کہو، اس کی سزا ہے مرے گھر میں

طعنہ مری مٹی کو ہے کیوں بے ثمری کا
اک پیڑ تو پھولا ہے پھلا ہے مرے گھر میں

اس شہر کی گلیوں میں اندھیرا ہے تو کیا ہے
اک دیپ تو ہر روز جلا ہے مرے گھر میں

maablib.org

گل برسنے لگے دامن میں دعا سے پہلے
مہرباں ہوگا بھلا کون خدا سے پہلے

آڑی ترچھی سی مقدر کی لکیریں دو چار
کیا تھا ہاتھوں میں ترے رنگِ حنا سے پہلے

رنگ برسانے کو آتے ہو مرے آنگن میں
بادلو! پوچھ تو لو بادِ صبا سے پہلے

چھینتے ہو جو مری عمر، اُسے دے دینا
بس یہی آخری خواہش ہے سزا سے پہلے

ہر گزرتے ہوئے موسم کے نشاں ہیں تن پر
اور بھی ظلم ہوئے ہم پہ ہوا سے پہلے

تیری آنکھ نے دریافت کیا آٹھواں رنگ
آگے دیکھا ہی نہ تھا رنگِ قبا سے پہلے

سدا سکھی رہیں وہ ہاتھ بھی جنھوں نے کبھی
ہماری پشت کو اِک درسِ تازیانہ دیا

rekhta.org

دھوپ اُتری تو دیکھو کتنے سندر پھول کھلے
گھر کے اندر برف تھی پھر بھی باہر پھول کھلے

کچھ سونا سونا سا لگتا تھا بے داغ بدن
کانٹوں کا کُرتا پہنا تب جا کر پھول کھلے

کچھ لوگوں میں بیچ پڑا جب آتش بازی کا
کیسی کیسی روشنیوں کے شب بھر پھول کھلے

پورب دکھن، ناگ پھنی اور ریتیلا میدان
ہم جس بستی میں ہیں اُس میں گھر گھر پھول کھلے

قلم لگاؤ، شاخیں چھانٹو پھر دیکھو انجام
اکثر مالی کے نشتر سے بہتر پھول کھلے

دیر سے سو کر اُٹھنے میں اِک یہ بھی ہے نقصان
توڑ کے لے جاتا ہے کوئی اکثر پھول کھلے

رنگ بھی سارے اُلٹے سُلٹے خوش بو بھی ناپید
مصنوعی موسم تھا تب تو جوکر پھول کھلے

چاند گہن ہو، رات ہو کالی گھر میں پڑے رہنا
کام کے نام پہ چل دیتے ہیں دفتر پھول کھلے

maablib.org

کھڑکیاں ویران، دروازہ کھلا رہ جائے گا
ہم نہ ہوں گے تو بھلا اس گھر میں کیا رہ جائے گا

گاؤں کے باسی اگر شہروں کو ہجرت کر گئے
کیا اکیلا مور بن میں ناچتا رہ جائے گا

سب ہوا پیا ہوئے تو کیا کریں گی کشتیاں
ڈوبنے کو کیا اکیلا ناخدا رہ جائے گا

پتھروں پر نام جو لکھتے ہیں، اے آتش فشاں
کیا سمجھتے ہیں کہ پتھر کا لکھا رہ جائے گا

سارے ماہی گیر اپنے جال بھر لے جائیں گے
اور زور آور سمندر دیکھتا رہ جائے گا

اِک مسافر ہے، چلا جائے گا وہ جادو سخن
ہاں زباں پر اس سے باتوں کا مزہ رہ جائے گا

مہرباں ہم پہ ہے کیا زہر کے بادل جیسا
شہر ہو جائے نہ سوکھے ہوئے جنگل جیسا

اب دھویں کا بھی تو کچھ ہو گیا خوش بو سا مزاج
کون جلتا رہا اس آگ میں صندل جیسا

بوئے بارود ہوئی ہے کسی ملبوس کو عطر
خوف لگتا ہے کسی آنکھ میں کاجل جیسا

پار اُترے بھی تو ساحل نے قدم تھام لیے
تند دریا کا کنارہ بھی ہے دلدل جیسا

اپنے پیروں کو رکھو زخم کی خاطر تیار
راستہ کوئی بھی ہوتا نہیں مخمل جیسا

موسم اس سے ہی بدلنے کا ہنر سیکھتے ہیں
برف ہے وہ، کبھی سورج، کبھی بادل جیسا

چل رہی ہے سبز موسم کی ہوا کس کے لیے
کون ہے بیمار لائے ہیں دوا کس کے لیے

دھوپ آئے گی تو کچے رنگ سب اُڑ جائیں گے
دے رہے ہو اپنی آنکھوں کو سزا کس کے لیے

کس پرندے نے بسیرا کرلیا ہے شاخ پر
اُٹھ گئے پتوں کے بھی دستِ دعا کس کے لیے

کس طرح کہہ دوں کہ صحرا ہے، اُفق کوئی نہیں
طے کیا ہے اتنا لمبا راستہ کس کے لیے

کوئی بے حس آگ کب بھڑکی ہے طوفاں کے بغیر
لے چلے ہو تم بھی دامن بھر ہوا کس کے لیے

غازۂ زینت ہے چہرے پر تو بالوں میں خضاب
بولتا ہے جھوٹ، سچا آئنہ کس کے لیے

کون تم کو پوچھنے آئے گا بنجر دشت میں
پتھروں پر لکھتے ہو اپنا پتا کس کے لیے

خلق بہری تو نہیں لیکن کیے ہے کان بند
ایسے عالم میں لگاتے ہو صدا کس کے لیے

maablib.org

اب کہاں وہ خواہشوں کی کہکشاں چاروں طرف
بیچ میں ہم اور خالی آسماں چاروں طرف

خود ہوا بے چین ہے تازہ ہوا کے واسطے
اس قدر ہے عود و عنبر کا دھواں چاروں طرف

حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی یاد سے
اُڑنے لگتی ہیں ہزاروں تتلیاں چاروں طرف

چوس کر زیرِ زمیں پھولوں کے پودوں کی غذا
اُگ رہی ہیں اُونچی اُونچی جھاڑیاں چاروں طرف

ہے تماشے کے لیے بس ایک چنگاری کی دیر
بیچ میں ہم اور سوکھی لکڑیاں چاروں طرف

کوئی تو دیوار سالم ہو سکوں کے واسطے
گھر میں کب ہوتی ہیں یارو کھڑکیاں چاروں طرف

سجدۂ بے جا سے تم نے اس کو پتھر کر دیا
اب جگانے کو بجاؤ گھنٹیاں چاروں طرف

کود پڑنا پُرخطر ہے، بیٹھ رہنا بھی زیاں
ناؤ میں سوراخ، خونی مچھلیاں چاروں طرف

maablib.org

چشمِ عبرت کبھی فطرت کا تماشا دیکھے
ڈوبتا مہر، اُبھرتا ہوا تارا دیکھے

تشنگی ہو تو رہے صبر کا منظر ایسا
جھوم کر ابر اُٹھے، گھوم کے دریا دیکھے

پیرہن آگ کا پہنے ہے، نہ شعلہ نہ دھواں
کوئی اُڑتے ہوئے جگنو کا سراپا دیکھے

شر میں ہوتا ہے سدا خیر کا پہلو کوئی
تیرگی میں بھی مری آنکھ اُجالا دیکھے

کس نے دیکھا ہے تمھارا سفرِ نیم شبی
کام وہ کرکے گزر جاؤ کہ دنیا دیکھے

کٹ گئی عمر اِسی شغل میں یاروں کی تمام
وہ دریچے کو، کبھی اُن کو دریچہ دیکھے

ہوں اگر پست تو کیا مجھ کو یہ اعزاز ہے کم
سوچتی آنکھ ہمیشہ مری اُونچا دیکھے

صرف پیراکی میں ہم ہارے ہیں، ڈوبے تو نہیں
بازوؤں کی مچھلیوں کا امتحاں، پانی میں تھا

کچھ تتلیوں سے تازہ ہوا دی گئی ہمیں
گویا کہ زندگی کی سزا دی گئی ہمیں

اُگنے لگے ہیں بال عجب رنگ رنگ کے
کیا جانے کیسی چیز پلا دی گئی ہمیں

پہلے لہولہان بدن کردیا گیا
پھر تحفتاً سفید قبا دی گئی ہمیں

ہونا تھا جس سے صرف بتوں کو معاملہ
وہ چیز بھی بنامِ خدا دی گئی ہمیں

کس طرح ہوتی اصل مزے کی بھلا خبر
چینی کی گولیوں میں دوا دی گئی ہمیں

چٹ جائیں تاکہ کان کی حساس جھلیاں
اتنے قریب آکے صدا دی گئی ہمیں

پوشیدہ جس میں زہر تھا، جس میں چھپی تھی آگ
وہ گیند کھیلنے کو دلا دی گئی ہمیں

ہوجائے کچھ جواز بلاؤں کا اس لیے
اتنی دعائے ردِ بلا دی گئی میں

باقرؔ ہم اپنے عہد کے برزخ میں ہیں مقیم
کیا زندگی برنگِ قضا دی گئی ہمیں

maablib.org

پائے ہیں دیکھیے اُڑنے کے لیے پَر کتنے
پار کرنے ہیں پرندوں کو سمندر کتنے

اِک بنانا ہے ہمالہ سے بڑا بت اُن کو
کوہ کن ہیں تو بہت، ہیں مگر آذر کتنے

کیجیے ماحولِ تنگ و دَو کی شکایت کس سے
خلیے پیکار میں ہیں خود مرے اندر کتنے

گھر کی دیوار کوئی بھی تو نہیں ہے سالم
چاہییں اور اُجالے کے لیے در کتنے

حشر تک ایک ہی انداز سے گھومے گی زمیں
پھر بھی لوگوں نے بنا رکھے ہیں محور کتنے

اہلِ قامت نے سجائی ہے سدادار و صلیب
تخت پر بیٹھتے دیکھے ہیں قلندر کتنے

پیاس کس کس کی بجھائے گا بھلا میرا لہو
ایک تنہا کے لیے نکلے ہیں خنجر کتنے

خلوتوں میں تو ملے حق کے پرستار بہت
بات کہہ سکتے ہیں دل کی سرِ منبر کتنے

maablib.org

پتھروں کا، سوندھی خوش بو کا نگر کیسا لگا
کانچ کے باسی تجھے مٹی کا گھر کیسا لگا

نرم تلووں سے کیا کیا گرم مٹی نے سلوک
گرم خو ماتھے کو ٹھنڈا سنگِ در کیسا لگا

رات کا جادو بھی کردیتا ہے کچھ کو کیا سے کیا
چاند کو دیکھو تو کیسا تھا مگر کیسا لگا

محفلوں کو تو بہت اچھی لگی مہکی فضا
پھول سے پوچھو کہ خوش بو کا سفر کیسا لگا

تتلیوں کے جسم پر اچھا تو لگتا تھا بہت
قبر میں شیشے کی وہ رنگین پر کیسا لگا

پھول تو آتے ہیں موسم میں مگر پھلتا نہیں
میرے حصے کی زمیں پر یہ شجر کیسا لگا

موسموں کے ساتھ کیا سب پیڑ بھی پاگل ہوئے
کیسا لگنا چاہیے تھا اور ثمر کیسا لگا

maablib.org

تجربہ خوب رہا اُس سے شناسائی کا
کھل گیا راز مری آنکھ کی گہرائی کا

عمر بھر اب یونہی بے ربط نظارے دیکھو
شوق آنکھوں کو تھا رنگوں کی پذیرائی کا

آنکھیں کھلوائیں دہکتے ہوئے سورج کی طرف
امتحاں یوں بھی لیا جاتا ہے بینائی کا

ایک موتی ہی پہ کیوں صبر کیے بیٹھے ہو
تم کو اندازہ نہیں سیپ کی گہرائی کا

جس کے واسطے آندھی کی ضرورت تو نہ تھی
ایک جھونکا ہی بہت ہوتا ہے پُروائی کا

ہوش مندانِ جہاں قتلِ ہنر کرتے رہے
خوں بھرا لے کے شلوکہ کسی سودائی کا

سحر بھی خواب رہے رنگِ شام بھی نہ ملے
مثالِ نقش مٹیں بھی، دوام بھی نہ ملے

عجیب چال چلے اب کی بار بردہ فروش
غریب بک بھی گئے اور دام بھی نہ ملے

پڑی تھی جس کے سبب اتنی خاکِ رسوائی
ہمیں اسی کی طرف سے سلام بھی نہ ملے

چراغ برف کی تاریکیوں میں کھوئے رہیں
شرر کوئی ترے سورج کے نام بھی نہ ملے

تمام عمر گزر جائے جس زمیں پہ وہیں
ہماری نسل کو اِذنِ قیام بھی نہ ملے

درِ نگہ پہ کوئی کشفِ نور ہو نہ سکے
فقیرِ علم کو سہمِ امام بھی نہ ملے

جو بار بار بدلتے رہے شجر کی جگہ
ملیں گے سوکھے ہوئے پھول ہی ثمر کی جگہ

اُڑے نہیں تو پرندو سزا کے طور کہیں
اُگیں نہ پھیلے ہوئے ہاتھ دونوں پَر کی جگہ

حسد کی آگ کے بدلے لگاؤ پیار کے پھول
فضا میں تاکہ اُڑیں برگِ گل شرر کی جگہ

ہمارے بعد کا انساں عجب نہیں کہ پھرے
لیے سر اور کسی کا خود اپنے سر کی جگہ

اِسی لیے تو گوارا ہے رات بھی ہم کو
کہ رات ہی میں چمکتا ہے وہ قمر کی جگہ

نہ بن سکا کبھی دشتِ سراب ہی دریا
نہ لے سکے گی کوئی روشنی سحر کی جگہ

کیسے کیسے ظلم کس کس باغ پر توڑے گئے
کونپلیں نوچی گئیں کچے ثمر توڑے گئے

کور آنکھوں کو گواہی کی سزائیں دی گئیں
چہچہاتی سوچ کی چڑیوں کے پَر توڑے گئے

چھوٹی موٹی روشنی شب کی سیاہی کھا گئی
سخت جاں تارے مگر وقتِ سحر توڑے گئے

بے کسوں کے دستِ مصروفِ دعا کاٹے گئے
رہ رووں کے پاؤں ہنگامِ سفر توڑے گئے

حملہ آور ٹولیوں کی بستیاں بستی رہیں
جو وہیں کے تھے اُنھی کے بام و در توڑے گئے

خاک و خس کے دام سے باہر نکل میری طرح
آتشِ خوابیدہ جلنا ہے تو جل میری طرح

ہر قدم پہ شکوۂ بے چارگی سے فائدہ
درد کی راہوں پہ چلنا ہے تو چل میری طرح

کب تلک بہتا رہے میری ہی آنکھوں کا عرق
برف زارِ قطب تُو بھی تو پگھل میری طرح

رات کی جھیلوں میں چھپڑ کے گا کہاں تک چاندنی
ڈھونڈ لے کوئی اُجالے کا کنول میری طرح

غازۂ بیگانگی تو ذلتِ رخسار ہے
خاک اپنے شہر کی چہرے پہ مل میری طرح

کچھ درختِ جاں کی گر منظور ہے نشوونما
شاخِ دل کی جھوٹی کلیوں کو مسل میری طرح

اُس زمیں میں تو مری آنکھوں کا سورج دفن ہے
اے کرن تو بھی تو چل پلکوں کے بل میری طرح

ذرا دیکھو مرے گملے کا پودا
مرے بچے سے اونچا ہو گیا ہے

خزاں زدہ انگلیوں سے ہم نے روش روش میں گلاب لکھے
زمین لکھی، فضائیں لکھیں، بہار لکھی سحاب لکھے

سنہری کرنوں کے پیرہن میں اُترتی پریوں کا رقص لکھا
دھنک کے رنگوں کی روشنائی سے آرزوؤں کے باب لکھے

وہ اب ہماری چھلکتی جھیلوں سے پیاس اپنی بجھا رہے ہیں
جنھوں نے ایامِ تشنگی میں قدم قدم پر سراب لکھے

کہاں تلک ساتھ دے سکے گی طویل تر رات بھی کہ اُس نے
نہ روزنِ ماہتاب لکھا، نہ نیند لکھی نہ خواب لکھے

وہ جس کے آنگن میں پھول چھینکے، منڈیر پر جس کی روشنی کی
وہی کم از کم کتابِ دل کا ہمارے نام انتساب لکھے

وہ جس کی قربت کی آنچ سے جسم رفتہ رفتہ پگھل رہا تھا
عجیب لطفِ فراق بھی دے، خطوط بھی لاجواب لکھے

اپنے انسان کی کوششوں کا ثمر دیکھنا
جسم پر اک بہادر کے بزدل کا سر دیکھنا

بازوؤں کا، لہو کی حرارت کا عالم نہیں
دیکھنا تو فقط زینتِ بال و پر دیکھنا

بارشوں میں جو یوں ہی چھتیں بھی ٹپکتی رہیں
ایک دن گر پڑے گا تمھارا یہ گھر دیکھنا

شام پت جھڑ کی آنے تو دو، رُت بدلنے تو دو
رنگ بدلے گا کیسا تمھارا شجر دیکھنا

ہم سے بے جان بنجر زمینیں بھی زندہ ہوئیں
اب خلا میں بھی اِک دن لگیں گے شجر دیکھنا

رات رنگین ہے سحر پرور ہے باقر مگر
جس طرف صبح کی روشنی ہو اُدھر دیکھنا

میں نے کب چاہا کوئی ایوانِ زر میرا بھی ہو
کیا نہیں ممکن کہ اِک چھوٹا سا گھر میرا بھی ہو

روشنی کے باب میں میری بھی قربانی رہے
اِک ستارا ڈوبتا وقتِ سحر میرا بھی ہو

دل کو کچھ بھایا نہیں کاغذ کے پھولوں کا چلن
خوش بوؤں کے دیس کا کوئی سفر میرا بھی ہو

آگ جو بھی زہر کی فصلوں کو خاکستر کرے
اُس میں شامل ایک ننھا سا شرر میرا بھی ہو

ختم ہوگا ایک دن تاریک گلیوں کا سفر
شاہراہوں سے کبھی شاید سفر میرا بھی ہو

جب لکھی جائے گی جدّ و جہدِ انساں کی کتاب
شاید اُس میں ایک حرفِ معتبر میرا بھی ہو

ایک دھاگے میں وہ ہر پھول پروئے جائے
اپنے ہی رنگ میں ہم کو بھی بھگوئے جائے

اپنے کھیتوں میں اُگاتا رہا آتش بازی
اب خلا میں بھی اُسی بیج کو بوئے جائے

کوئی کرنوں کے سمندر میں جلا جائے، کوئی
کوزۂ خواب میں آنکھوں کو ڈبوئے جائے

ہاتھ میں ہاتھ دیے ساتھ وہ چلتا بھی رہے
اور پہلو میں کوئی چیز چبھوئے جائے

اب تو اٹھنا ہی پڑے گا ہمیں طوفاں بن کر
کب تلک ابر کی صورت کوئی روئے جائے

خاک اُڑتی ہو اگر دل میں تو کیسے کوئی
آنکھ میں رنگ کے دریا کو سموئے جائے

کام ہم کر کے دکھائیں گے نرالا اَب کے
تیرگی ہی سے نچوڑیں گے اجالا اَب کے

گرنے والا تھا شجر اپنی جڑوں سے کٹ کے
دے دیا بادِ مخالف نے سنبھالا اَب کے

کن گناہوں کے عوض قحط پڑا ہے ایسا
گھر سے خود ماؤں نے بیٹوں کو نکالا اَب کے

کیا خبر تھی کہ محافظ ہی بنے گا قاتل
کھا گیا چاند کو خود چاند کا ہالا اَب کے

دل ہی کیا اور بھی اعضا کے خریدار ہیں لوگ
کوئی بازار میں آئے تو جیالا اَب کے

روز کیوں آتا ہے دریا خواب میں
سال بھر گزرے گا کیا سیلاب میں

کرلیا پورے سمندر کا سفر
جا کے ڈوبے گاؤں کے تالاب میں

کھو گئے جھوٹی صداؤں کے نقیب
اپنی ہی آواز کے گرداب میں

ہیں بہم آسائشیں ساری مگر
روشنی کا قحط ہے محراب میں

ہے ہماری بھی تو دُہری شخصیت
دھوپ میں اِک، دوسری سرداب میں

یہ زمیں اب آپ کے قابل کہاں
جایئے گھر کیجیے مہتاب میں

سارے دُکھ سکھ سہ لینا، مر جانا میرے لال
لیکن اپنی مٹی مت ٹھکرانا میرے لال

غیر جہاں کہلائیں اُس بارونق بستی سے
بہتر ہے اپنا اُجڑا ویرانہ میرے لال

جب تک سانس چلے اُس دم تک ساری رونق ہے
اس کے بعد تو سب کچھ ہے افسانہ میرے لال

اس کل جگ میں جو بھی اپنے سچے روپ میں ہو
اُس کو سارے کہتے ہیں دیوانہ میرے لال

اِک دن فصل ضرور اُگے گی، کاٹے خواہ کوئی
جب تک ہو بکھراتے رہنا دانہ میرے لال

سورج چمکے گا تب ہی بادل بھی اٹھیں گے
جلتی دھوپ سے ہرگز مت گھبرانا میرے لال

ہر مٹی کا حق ہے پانی، ابر نہ برسیں تو
صحراؤں میں بھی نہریں پہنچانا میرے لال

ہر دم خود کو دیکھو تو پاگل ہوجاؤ گے
دھوکا ہوتا ہے آئینہ خانہ میرے لال

ہم نے جیون رو رو کاٹا پھر بھی کیا پایا
جیسی بھی گزرے پھر بھی مسکانا میرے لال

کتنے دن یہ رنگ رہے گا کب تک ہے یہ روپ
جسم کے کندن پر کیسا اترانا میرے لال

میں نے لب سی کر لکھی ہیں، جب بھی ممکن ہو
اِن غزلوں کو اُونچے سُر میں گانا میرے لال

آنکھوں سے دور رات کا پردہ تو ہوگیا
اب پھول بھی کھلیں کہ سویرا تو ہوگیا

مشکل یہ آ پڑی ہے کہ جگنو کہاں رہیں
سورج کا گاؤں میں ڈیرہ تو ہوگیا

اپنا دیا جلا نہیں لیکن خوشی یہ ہے
کچھ دوستوں کے گھر میں اُجالا تو ہوگیا

تھوڑا بہت تو سوکھتی کھیتی کو بھی ملے
آزاد اپنے بند سے دریا تو ہوگیا

پوچھا کسی نے سوکھتے پتوں کا حال بھی
رنگینیِ بہار کا چرچا تو ہوگیا

کلیوں کی رُت کب آئے گی مہکیں گے پھول کب
اونچا بہت گلاب کا پودا تو ہوگیا

ہوئی ہے شام پرندے چلے شجر کی طرف
چلو کہ لوٹ چلیں ہم بھی اپنے گھر کی طرف

اسی سے لوگ امیدِ بہار کرتے رہے
خزاں بھی آئی نہ جس شاخِ بے ثمر کی طرف

ہوائے ظلم میں جلتے رہے ہیں شہر کے شہر
گیا نہ ایک شرارہ بھی اہلِ شر کی طرف

یقین ہے کوئی اچھی خبر بھی آئے گی
لگے ہیں کان مرے آلۂ خبر کی طرف

نظر میں آ نہ سکا لشکروں کا جاہ و جلال
اٹھی نگاہ تو بس اک بریدہ سر کی طرف

بتوں کے آگے وہ کیوں سجدہ ریز ہے باقرؔ
ملائکہ نے کیا سجدہ جس بشر کی طرف

رفتہ رفتہ بھیگے موسم کی دعا لگنے لگی
گھر کے پودوں کو بھی باہر کی ہوا لگنے لگی

چاند پر جانے کی دھن میں کتنے دیوانے تھے ہم
چاند پر پہنچے تو دھرتی خوش نما لگنے لگی

بہہ چکا ہے اس قدر معصوم جسموں کا لہو
اب مری مٹی بھی خاکِ کربلا لگنے لگی

برگ و گل سب تھے اُسی کے سبز ہاتھوں کے طفیل
رُت خزاں کی بھی ہمیں اُس کی عطا لگنے لگی

سوچیے تو ہوگا خود کتنا بڑا خالق، خدا
خاک کی مخلوق بھی جس کی خدا لگنے لگی

بادِ کج رو میں سرِ شاخِ صنوبر ہوتا
گل سے پوچھے کوئی کیسا ہے گلِ تر ہوتا

نیلگوں رنگ ہے صدیوں کی ریاضت کا صلہ
اتنا آساں نہیں قطرے سے سمندر ہوتا

ہر برس ہوتی ہے کچھ اور ہوا طوفانی
نونہالو مرے کوچے کے تناور ہوتا

پڑ گیا قحط صداؤں کا تو اے دیدہ ورو
بولتے کیوں نہیں تم بھی تو سخن ور ہوتا

کان میں کہتی ہے اکثر کوئی غیبی آواز
آج کی رات تم اس شہر سے باہر ہوتا

بے گھری میں تو بس اِک غم تھا کہ بے گھر ہیں ہم
کتنے آزار لگا دیتا ہے اِک گھر ہوتا

کبھی تو یاد کے گُل دان میں سجاؤں اُسے
کبھی وہ سامنے بھی ہو تو بھول جاؤں اُسے

کھلے جو ہیں مری شاخِ خیال پر کچھ گُل
اُسی کا کھیل ہے یہ کس طرح بتاؤں اُسے

وہ خوش بوؤں کی طرح آئے اور اُڑ جائے
میں کیسے پیرہنِ ذہن میں بساؤں اُسے

پتا تو ہو کہ ہے کیا کربِ زخمِ نظارہ
نہ دیکھنا جسے چاہے وہی دکھاؤں اُسے

وہ حرفِ سوختہ سطحِ زباں تک آئے تو
میں اپنے لہجۂ روشن سے جگمگاؤں اُسے

اُسی کے رنگ کا پہنا اگر لباس تو کیا
اُسی کی طرز میں اب شعر بھی سناؤں اُسے

اگر ہے عشق تو پھر ایسا عشق ہو باقرؔ
وہ گنگنائے مجھے اور میں گنگناؤں اُسے

نظر سے تو نے جو سب کی چھپا کے رکھا ہے
وہ روپ مجھ کو تو دکھلا دے ماہ تابِ مرے

یہ کچھ نہیں ہے جو ستم آباد نے کیا
اس سے بُرا سلوک تو اولاد نے کیا

ہر شب اُنڈیلتا رہا آنکھوں میں روشنی
کیسا عجب ستم، ستم ایجاد نے کیا

یارب! ترے غلام ملائک کریں گے کیا
سجدہ تجھے جو فطرتِ آزاد نے کیا

کم زور تھے ضرور مگر آبرو تو تھی
رُسوا ہمیں بہت تری امداد نے کیا

اُڑتا ہوا کے دوش پہ پھرتا ہے آدمی
پیدل سفر غریب پری زاد نے کیا

جتنا بڑھے ہیں اُتنی ہی دنیا سمٹ گئی
مجبور ہم کو ہر نئی ایجاد نے کیا

چمن سے ہول آتا ہے صبا اچھی نہیں لگتی
قفس پروردہ کو روشن فضا اچھی نہیں لگتی

عجب طائر ہمارے گھر کی دیواروں پہ رہتے ہیں
جنھیں پرواز میں تازہ ہوا اچھی نہیں لگتی

اِنھی ہونٹوں سے مانگی تھی ابد کی زندگی تو نے
ترے لب پر قیامت کی دعا اچھی نہیں لگتی

یہ مانا کچھ مکینوں کا چلن اچھا نہیں لیکن
در و دیوار کو اس کی سزا اچھی نہیں لگتی

تو کیا بیمار کو بس یونہی مر جانے دیا جائے
مریضوں کو اگر کڑوی دوا اچھی نہیں لگتی

مدد کے واسطے کالی بلاؤں کو بلاتے ہو
ہمیں یارو تمھاری یہ ادا اچھی نہیں لگتی

سبز قلم سے کانٹوں کے جنگل تحریر ہوئے
سرخ ہواؤں کے ہاتھوں صحرا تعمیر ہوئے

کتنے سنگ صفت پیکر تھے جن میں جان پڑی
کیسے کیسے زندہ منظر کیا تصویر ہوئے

طاری تھا جن آنکھوں پر کم خوابی کا آشوب
جاگتی آنکھوں کے سپنے اُن کی تعبیر ہوئے

بے تدبیر کمانیں تھیں اور اُس پہ سنہرے ہاتھ
تیر بھی ہم نے ہی کھایا ہم ہی زنجیر ہوئے

آوازوں میں رنگ نہ تھے اور حرف بھی تھے بے جان
سارے نغمے، سارے منظر بے تاثیر ہوئے

کب خود اپنے دل کا کوئی مدعا ہم نے سنا
دوسروں کے منھ سے اپنا واقعہ ہم نے سنا

اور کیا ملتا ہمیں ظالم سے قربت کا صلہ
جرم اُس کا تھا سزا کا فیصلہ ہم نے سنا

جاگتی آنکھوں سے شاکی ہی رہے منظر کے رنگ
بے ردا کانوں سے حرفِ بے صدا ہم نے سنا

بستیوں میں گائے جاتے تھے ترانے جس کے
جنگلوں میں نوحۂ شہرِ ہوا ہم نے سنا

کیسے ممکن ہے کہ وہ روحِ بہار آ کر گیا
ایک پتا بھی کہیں کوئی گرا ہم نے سنا

وقت جب آئے گا شامِ ہجر میں امداد کا
سننے والا بھی نہیں ہوگا کوئی فریاد کا

رنگ و بو سے کھیلنے والے کبھی سوچا بھی ہے
رنگ کیا ہوگا تری اولاد کی اولاد کا

لہجہ و تہذیب ماضی کے ورق ہوجائیں گے
صرف شجرے تک نشاں رہ جائے گا اجداد کا

ہم تو پکے ہیں بہت اپنے عقیدے میں مگر
دیکھیے ہوتا ہے کیا مذہب بہو داماد کا

قہر ہوتا ہے سکوں بھی گر زباں بندی سے ہو
ہم کو ہے منظور فتنہ بھی لبِ آزاد کا

کیا ضروری ہے کہ دولت علم کی ہو اُن کے پاس
بوجھ کاندھے پر لیے پھرتے ہیں جو استاد کا

سارا جہاں تھا مبتلا برف کے امتحان میں
کھلتے رہے ہیں گل مگر شیشے کے سائبان میں

لطف شنائے بحر اور خوف نہنگ کیا انھیں
رہنے لگیں جو مچھلیاں شیشے کے مرتبان میں

وہ جو شکار ہوگیا اس کو درندہ کیوں کہو
اصل میں وہ درند ہے بیٹھا ہے جو مچان میں

لطف مقابلہ ہے جب دونوں میں ہو برابری
تم بھی ہو آسمان میں ہم بھی ہوں آسمان میں

گھر کے مکیں کے واسطے گھر میں جگہ نہیں رہی
عیش کے سب لوازمات رہنے لگے مکان میں

اپنے طاق میں ہم اوروں کے دیے جلائیں گے کب تک
دل کے لکھے گیت کسی کی تال پہ گائیں گے کب تک

ایک اگربتی سے محفل مہک تو جائے گی لیکن
کاغذ کے پھولوں سے بھونروں کو بہلائیں گے کب تک

مجمعِ راہ رواں میں بہت سے اہلِ علم و نظر بھی ہیں
نابالغ نابینا اُن کو راہ دکھائیں گے کب تک

کوئی دن سیلاب غضب کا سب کو بہا لے جائے گا
مٹی کے کچے پشتے شہر بچائیں گے کب تک

ایماں والے چاہ رہے ہیں نکلیں کام دعاؤں سے
بے چارے رحمت کے فرشتے مدد کو آئیں گے کب تک

باہر میلے کی رونق ہے اندر سہمے ہیں بچے
خوف کے پرچم میرے آنگن میں لہرائیں گے کب تک

مٹی میں مل کر ذرہ بھی مٹی ہی کہلاتا ہے
مٹی تیرے پوت مہاجر ہی کہلائیں گے کب تک

پلٹ کے آئے مسافر تو شہر تھا خالی
بس ایک ڈھیر سا پتوں کا ہر مکاں میں تھا

اب کفِ دریا نہ موجوں کی روانی دیکھنا
ہوگیا کس رنگ کا دریا کا پانی دیکھنا

بند دریاؤں پہ باندھے تھے کسانوں کے لیے
جذب ہوتا ہے کہاں نہروں کا پانی دیکھنا

پیٹھ پر پانی کی چھاگل ہاتھ کے کرچھے میں آگ
کی مددگاروں نے کیسی شہر بانی دیکھنا

کہہ رہے ہیں حادثوں سے کھیلتے بچوں کے دل
بچ گئے ہم تب ہماری نوجوانی دیکھنا

دیکھ لیں سیلاب میں زم زم کے بہتی بستیاں
کوہِ رحمت کی بھی اب آتش فشانی دیکھنا

لوگ جو کوئی نیا منظر بنا سکتے نہیں
مشغلہ اُن کا ہے تصویریں پرانی دیکھنا

شیر و بُز ہو جائیں گے اِک دوسرے کے غم گسار
وقت آنے پر ہماری حکمرانی دیکھنا

لوحِ مرقد پر پرندے بیٹ کر جاتے ہیں روز
دیکھنا صاحبقرانوں کی نشانی دیکھنا

maablib.org

گل آئے کبھی اور کبھی شاخوں پہ ثمر آئے
کیا کیا تری رحمت کے فرشتے مرے گھر آئے

کچھ سوئے ہوئے جسم کا احساس تو جاگے
اِک تیر ہی آہستہ سے پہلو میں اُتر آئے

پھرتے ہیں لگائے ہوئے ہم دھوپ کی عینک
شاید کبھی دن ہی میں نیا چاند نظر آئے

کرتے رہے سب سنگ زنی جن پہ ازل سے
وہ بت ہمیں ہنگامِ عبادت بھی نظر آئے

آمادۂ پیکار ہیں ساحل پہ عدو پھر
اچھا ہو کہ اِک بار سمندر میں بھنور آئے

ہدیہ مرے ہونٹوں کا، مری آنکھوں کی تسلیم
پڑھتا کبھی نیزے پہ جو قرآں کوئی سر آئے

نہ شرارت اس میں حروف کی نہ قصور کوئی کتاب کا
ہے معاملہ تو نسب کا ہے جو فتور ہے تو نصاب کا

جو ہنسی ہنسی میں لگائی تھی، کبھی بھول کر نہ بیچائی کی
یہ چمن تمام کرشمہ ہے اسی خشک شاخِ گلاب کا

وہ جو بستیاں تھیں بڑی بڑی انھیں سیل وقت کی لے گئی
وہی سانس سانس بسا رہا جو تھا ورد قریۂ خواب کا

وہی حرف مجھ سے خفا رہا وہ جو لفظ لفظ کی جان تھا
رہا سادہ سادہ سا ہر ورق مری داستانِ شباب کا

لیے جا رہا ہے کشاں کشاں اُسی سمت جذبۂ تشنگی
کوئی نہر تک نہ پہنچ سکے یہی فیصلہ ہے سراب کا

ظلمت سے چراغوں کو نکلنے نہیں دیتے
جل اُٹھیں تو آرام سے جلنے نہیں دیتے

جس پیڑ پہ ہوتے ہیں پرندوں کے بسیرے
کچھ لوگ اُسی پیڑ کو پھلنے نہیں دیتے

آیا ہے عجب وقت کہ ماں باپ گھروں سے
بچوں کو کسی وقت نکلنے نہیں دیتے

اِس دور میں جینا ہے کسی تار پہ چلنا
اور جھونکے ہواؤں کے سنبھلنے نہیں دیتے

اب دیکھنا یہ بھی ہے کہ یہ جھومتے بادل
کب تک مرے سورج کو نکلنے نہیں دیتے

موجوں کے ڈھنگ اور ہیں پانی کچھ اور ہے
اس بار ندیوں میں روانی کچھ اور ہے

کل شام کی شفق میں کئی رنگ تھے نئے
خوش بو میں آج رات کی رانی کچھ اور ہے

موئے قلم خلاف ہو، چاہے خفا ہوں رنگ
تصویر اَب کے ہم کو بنانی کچھ اور ہے

کہہ دوں تو ٹوٹ جائے گا الفاظ کا بھرم
لکھا ہوا کچھ اور، کہانی کچھ اور ہے

پھولوں پہ کھل رہے ہیں ہماری دعا کے رنگ
موسم پہ اَب کے بار جوانی کچھ اور ہے

دوا بغیر کوئی طفل مر گیا تو کیا ہوا
بس ایک پھول ہی تو تھا بکھر گیا تو کیا ہوا

کبھی کبھی تو روشنی بھی اِک عذابِ جاں ہوئی
وہ چاندنی سے تیری کوکھ بھر گیا تو کیا ہوا

نہ رات ہی سنور گئی، نہ روشنی ہی مر گئی
اندھیری باؤلی میں چاند اُتر گیا تو کیا ہوا

کمال جگنوؤں کا تھا کہ روشنی میں کھو گئے
فریب اپنے سائے ہی سے ڈر گیا تو کیا ہوا

مرے لیے تو خواب ایک چشمۂ حیات تھا
کسی کو خواب، خواب تھا بکھر گیا تو کیا ہوا

گزرتے موسموں کے قافلے تو روندتے رہے
غریب کوئی صحن سے گزر گیا تو کیا ہوا

نہ میں کوئی سوار ہوں، نہ کوئی مال دار ہوں
اِدھر رہا تو کیا ہوا، اُدھر گیا تو کیا ہوا

آج یہاں کل وہاں، یہی ہے باقرؔ اپنا حال
ہر مٹی دُھتکارے جب سے چھوڑ دیا پریاگ

سر بھی نئے نہ تھے، کوئی پتھر نیا نہ تھا
میرے لیے تو کوئی بھی منظر نیا نہ تھا

قزاق بن کے اَب کے ہوا لوٹ لے گئی
حالاں کہ کشتیوں کو سمندر نیا نہ تھا

پالی گئی تھیں حوض میں جو اہتمام سے
اُن سیپیوں کے پاس بھی گوہر نیا نہ تھا

اِس رخصتی پہ خاکِ شفا ہے سنگھار کو
اُس کے لیے تو کوئی بھی زیور نیا نہ تھا

کیا جانے کس کے ہاتھ لگی ہے دروپدی
اپنے لیے تو یہ بھی سوئمبر نیا نہ تھا

نیچی چھتیں، گھٹے ہوئے در، تنگ کھڑکیاں
سچ پوچھیے تو کوئی نیا گھر نیا نہ تھا

اندر کا حال تیرے سوا جانتا ہے کون
موسم ترے حجاب کے باہر نیا نہ تھا

زینتِ روزن و آسائشِ در کیا ہوگی
کوئی سورج ہی نہ ہوگا تو سحر کیا ہوگی

ذلت کے جہنم میں اُترنا تو اُسے تھا
ہم ڈر گئے کس بات سے ڈرنا تو اُسے تھا

منظر کی امانت تھے جو، کیا ہو گئے وہ پھول
وہ تودۂ خاشاک! بکھرنا تو اُسے تھا

اے مصلحتِ وقت کے ناپاک سمندر
تو جس کو ڈبوتا ہے اُبھرنا تو اُسے تھا

کیوں ہم کو پہننے پڑے بارود کے زیور
ریزوں کی طرح رَن میں بکھرنا تو اُسے تھا

خواہاں تھے شہادت کے سو تم لے گئے بازی
رزمِ حق و باطل ہے یہ، مرنا تو اُسے تھا

سب وار کارگر ترے منتر کے ہوگئے
آئینہ دیکھتا تھا کہ پتھر کے ہوگئے

اِس بار گہری سوچ میں ڈوبی ہے جل پری
جیسے زمیں کی طرح سمندر کے ہوگئے

کٹ جائے درمیان سے جیسے کوئی بدن
ٹکڑے کچھ اِس طرح سے مرے گھر کے ہوگئے

پہلے ہوا تھا صرف لکیروں کا اہتمام
پھر سارے رنگ بھی اُسی منظر کے ہوگئے

مانا کہ جبرِ آب و غذا سے مفر نہیں
کیا طائرِ خیال بھی بے پَر کے ہوگئے

طوفاں اُٹھا کے چائے کی پیالی میں شر پسند
ناکام ہوگئے تو سمندر کے ہوگئے

یہ شہر آباد ہو کر بھی ہے ویرانہ نہ جانے کیوں
مقفل رہتا ہے ہر گھر کا دروازہ نہ جانے کیوں

ہوائیں ہی نہیں بے مہر، موسم ہی نہیں پاگل
یہاں اِک سمت دریا بھی نہیں بہتا نہ جانے کیوں

کوئی آسیب تو پیچھے نہیں ہر چلنے والے کے
مگر کوئی بھی آہستہ نہیں چلتا نہ جانے کیوں

maablib.org

ہجومِ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں نوجواں لیکن
بوقتِ مرگ تنہا رہ گیا بوڑھا نہ جانے کیوں

تمازت اپنی کر آتا ہے شاید صَرف صحرا میں
نکلتا ہے یہاں سورج بھی شرمندہ نہ جانے کیوں

نہ شاہی میں جلالت ہے نہ شہ میں کرّ و فر باقی
فقط لڑکا نظر آتا ہے شہزادہ نہ جانے کیوں

جسے دیکھو وہی بے چین ہے اِس کے لیے لیکن
ہمیں بے کیف سی لگتی ہے یہ دنیا نہ جانے کیوں

بارشوں کی دُعا اُسی کی تھی
کوئی الزام اُس کے سر تو گیا

maalib.org

یہ موسم ہے جنگل پہ بھاری بہت
ہرن ایک ہے اور شکاری بہت

اٹھانا پڑے گا اُجالوں کا قہر
رہی شب پرستوں سے یاری بہت

وہاں پا پیادہ چلو تب ہے بات
جہاں ہر قدم ہو سواری بہت

بہت جسم پر زخم کاڑھے گئے
ہوئی دل کی پیوند کاری بہت

ابھی صرف غش ہی میں ہے دیوتا
لگے ہیں چتا میں پجاری بہت

وطن اپنے بیٹوں کو دھتکار دے
جہاں میں ہیں ایسے بہاری بہت

کبھی اپنے رُتبے کا احساس کر
بہت ہو چکی خاکساری بہت

عجب ساحل کا منظر ہوگیا ہے
پیالوں میں سمندر ہوگیا ہے

اب تو دشمن بھی نہیں کوئی، شناسا کیسا
ہجرتوں نے بھی ہمیں کردیا تنہا کیسا

عید پر کارڈ ملیں، موت پہ پھول آتے ہیں
بوڑھے ماں باپ سے رہ جاتا ہے ناتا کیسا

لوگ دولت سے شرافت کا ہنر سیکھتے ہیں
اب زمانے میں اہم ہوگیا پیسا کیسا

دیکھنے والے تھرکتے ہیں تماشے کی جگہ
اِک مداری نے دکھایا ہے تماشا کیسا

ہو کے مایوس پلٹ آتے ہیں جانے والے
چاند ایسا ہے تو ہوگا مرا تارہ کیسا

بدمزہ کرتا ہے احساسِ امیری کتنا
ہو سمندر تو بدل جاتا ہے دریا کیسا

محلوں کے گُن گانے والا ہی محبوب ہوا
جس نے اپنا راگ اَلاپا وہ مصلوب ہوا

نہروں پر قبضہ کرنے والے بے نام رہے
پیاسے ہونٹوں سے ٹھنڈا پانی منسوب ہوا

آئینہ تھا، نور کا چہرہ تو دکھلاتا تھا
وحشی دل بھی ڈوب گیا جب چاند غروب ہوا

دل کے خوں ہونے کا منظر کیا دکھلائیں اُسے
لختِ جگر کے گم ہونے پر جو یعقوب ہوا

کیا بتلائیں کیا جادو رکھتے ہیں پیار کے لفظ
کتنے زخموں کا مرہم تیرا مکتوب ہوا

کتنی پشتیں چھوٹے سے گھر میں رہ سکتی تھیں
جد کے گھر سے ہجرت کر جانا ہی خوب ہوا

گھر گھر رونق ہی رونق ہے باہر کوئی نہیں
سارے رنگ فراہم ہیں پر منظر کوئی نہیں

گونگوں کے گھر سے اُٹھتا ہے شور اذاں جیسا
اہلِ زباں بستی کے بیچ سخنور کوئی نہیں

پھول کے بیج بکھیرو تو نکلیں گے پھول ہی پھول
یارو اس سنسار میں دھرتی بنجر کوئی نہیں

باتوں کے جادو سے سارے کام نہیں بنتے
محنت کر! محنت سے بڑھ کر منتر کوئی نہیں

اپنی حرص و ہوس نے کیے ہیں شاہ و گدا تخلیق
سارے مٹی کے پُتلے ہیں برتر کوئی نہیں

دیکھا ہے ہم نے صبح کا چہرہ قریب سے
اکثر گزر گیا ہے ستارہ قریب سے

گلیوں میں پھر کے لذتِ آوارگی ہے خوب
دیکھی ہے کس نے وحشتِ صحرا قریب سے

اِس قرب و التفات کا مطلب ہے اور کچھ
ہوتا خطا نہیں ہے نشانہ قریب سے

آئی ہے شاخ شاخ کو کچھ خوش پروں کی یاد
گزرا ہے جب بھی کوئی پرندہ قریب سے

نکلا فریب دور کا منظر کبھی کبھی
اچھا وہی ہے جو لگے اچھا قریب سے

دریا ہی خشک ہو تو شناور کہاں سے آئے
ہر سیپ خود غرض ہو تو گوہر کہاں سے آئے

یا تو زمین خشک ہے یا زیرِ آب ہے
ایسا نظام ہو تو گلِ تر کہاں سے آئے

مانا کہ سارے شہر میں دشمن نہیں کوئی
سب مہربان ہیں تو یہ پتھر کہاں سے آئے

ہر شخص اپنے آپ میں خود قلعہ بند ہے
مشکل یہ ہے کہ فاتحِ خیبر کہاں سے آئے

خوفِ زیاں نہیں ہے تو سامانِ جنگ کیوں
اب دورِ امن ہے تو یہ لشکر کہاں سے آئے

سونا ہے تیری دھوپ تو روپا ہے چاندنی
اے میرے شہر تجھ میں یہ جوہر کہاں سے آئے

ہے یقیں خود پہ تو کیا، ڈر تو کسی اور کا ہے
ایسا لگتا ہے ترا سر بھی کسی اور کا ہے

اے ہوا باز بہت ہے تری پرواز اُونچی
جسم تیرا ہو مگر پَر تو کسی اور کا ہے

کیا پرستش کے لیے خوب تراشے ہیں صنم
یہ کبھی سوچ کہ پتھر تو کسی اور کا ہے

ہر کوئی خود کو سمجھتا ہے بساطِ ہستی
ہم بس اِک رنگ ہیں منظر تو کسی اور کا ہے

لذتِ زخم نے خود کردیے سب راز عیاں
ہاتھ تیرے ہیں پہ خنجر تو کسی اور کا ہے

کب تلک اُچھلو گے لہروں کے سہارے باقرؔ
یہ نہ بھولو کہ سمندر تو کسی اور کا ہے

یوں دیکھنے میں دُھند کا صحرا دکھائی دے
عینک اگر لگاؤں تو اُلٹا دکھائی دے

بیدار ہوں تو پھول ہی کھلنے لگیں تمام
ہوں خواب میں تو خون اُبلتا دکھائی دے

خوش ہوں تو تیز دھوپ لگے نرم چاندنی
بے تاب ہوں تو چاند سلگتا دکھائی دے

یہ کیسا شہر ہے کہ جو آباد ہے مگر
دیکھو بلندیوں سے تو صحرا دکھائی دے

ابلیس کا خیال بھی پیشِ نظر رہے
باقرؔ جو تم کو کوئی فرشتہ دکھائی دے

مدِ مقابل کوئی نہیں کیسے تلوار چلے
باری آنے سے پہلے ہی بازی ہار چلے

سورج نکلا، ڈوب گیا، تم سوئے پڑے رہے
گلیاں سب سنسان ہوئیں اب کیا بازار چلے

بے سدھ پتھر ہی سے پیدا ہوں گے کتنے دیر
کوئی ہنرور ہاتھ ملے، کوئی اوزار چلے

نیا نگر آباد کرو اور بدلو اپنی چال
اُس رَستے پر کیا چلنا جس پر سنسار چلے

باقرؔ ہم نے ایسا بھی منظر دیکھا اِک دن
چلنے والے ساکت تھے اور در دیوار چلے

کوئی نیا مرض نئی وبا نہیں چلی
بہت دنوں سے جانے کیوں ہوا نہیں چلی

فضا میں رنگ ہیں نہ آسمان پر چمک
زمین جیسے اپنا راستہ نہیں چلی

گلی گلی ببول مہربان تھے بہت
بدن تو چل پڑا مگر قبا نہیں چلی

ہنر تمام تم نے اپنے آزما لیے
نئی نہ تھی اِسی لیے نوا نہیں چلی

بھٹک رہی ہیں راستوں میں خشک پتیاں
بہت دنوں سے مہرباں ہوا نہیں چلی

نیشِ عقرب نہ سمِ مار سے ڈر لگتا ہے
اے چمن ہم کو ترے خار سے ڈر لگتا ہے

اِس قدر ہو گئے تنہائی کے عادی کہ ہمیں
رونقِ کوچہ و بازار سے ڈر لگتا ہے

رات اِک وسوسۂ بے خبری میں گزرے
صبح ہو جائے تو اخبار سے ڈر لگتا ہے

ہاں کسی طرح گزر جائے گا سیلاب مگر
اپنی بھیگی ہوئی دیوار سے ڈر لگتا ہے

گھر گراتا ہے ہر اِک، پھر سے بنانے کے لیے
اِس لیے ہر نئے معمار سے ڈر لگتا ہے

کر سکا کوئی بھی دشمن نہ ہراساں لیکن
اب ہمیں اپنی ہی تلوار سے ڈر لگتا ہے

maablib.org

یوں بظاہر بے ضرر لگتی ہے دیوانی ہوا
پیڑ گر جاتے ہیں ہوجائے جو طغیانی ہوا

خشک صحرا کو وہی اِک تحفۂ گرد و غبار
ہاں جزیروں کے لیے لے آئے گی پانی ہوا

دور تک شاخوں پہ دیکھو ایک کونپل بھی نہیں
دے گئی پیڑوں کو کیسا درسِ عریانی ہوا

سخت موسم آئے تو پتوں کا سایہ بھی نہ دے
پھول کھلتے ہوں تو کرتی ہے گل افشانی ہوا

تھی کبھی وجہِ تلاطم، بادبانوں میں کبھی
بہتے دریاؤں کا کہنا بھی کہاں مانی ہوا

تنگ گلیوں میں سسکتی کھڑکیاں رہ جائیں گی
شاہراہوں سے گزر جائے گی سلطانی ہوا

ہے بسی ہر موج میں اِک دل رُبا خوش بو کوئی
آج کس کی چوم کر آئی ہے پیشانی ہوا

ابرِ رحمت کوئی برسے، کوئی طوفاں آئے
منتظر سوکھی ہوئی ریت ہے دریاؤں کی

ہے تو بہار کی کونپل تو میرا پیار درخت
ترا ورود ثمر میرا انتظار درخت

جو میرے اور مرے سورج کے درمیاں آئے
مجھے پسند نہیں اتنا سایہ دار درخت

یہ دیکھنا ہے کہ ہوتے ہیں بار ور کتنے
بہار میں تو بہت سے ہیں پھول دار درخت

ہے اہلِ شہر پہ یہ کیسا خوف کا عالم
کہ گھر کے گرد لگاتے ہیں خاردار درخت

نئی بہار کا، ظالم ترین موسم میں
کس اعتماد سے کرتے ہیں انتظار درخت

بچا کے برف سے رکھا تھا جس کو کمرے میں
ہُوا ہے جوشِ نمو میں وہ چھت کے پار درخت

ہمارے بعد تو دنیا بدل گئی ہے وہاں
بچا ہے اِک وہی پیپل کا یادگار درخت

ملے مسمار گھر اہلِ حرم کے
ہُوا ہے اب کے غالب ابرہا کیا

صبا چلی نہ کھلے گل نہ کوئی یاد آئی
عجب طرح کی سحر مدتوں کے بعد آئی

بھٹکتے پھرتے ہیں خوابوں کے بن کے شہزادے
نہ اَب کے رات ہی اُتری نہ شہرزاد آئی

یہ کیا کہ روزِ قیامت کی طرح دن گزرا
یہ کیا کہ شام بھی آئی تو بے مراد آئی

ہماری سوچ بھٹکتی رہی ہوا کی طرح
کہیں سے اشک چنے اور کہیں سے شاد آئی

کہاں گئیں وہ فصیلیں کدھر ہیں دروازے
یہ کیسے شہر میں پھر فوجِ برق و باد آئی

بات پوری کہاں ہوئی ہے ابھی
وہ کہانی تو اَن کہی ہے ابھی

شام تاریک ہو رہی ہے تو کیا
میرے دل میں تو روشنی ہے ابھی

ابر برسے نہیں بہت دن سے
پھر بھی باقی بہت نمی ہے ابھی

ہوں گے بیدار خواب سے اِک دن
اپنی تقدیر جاگتی ہے ابھی

ہر طرف برف گر رہی ہے مگر
آتشِ گل سلگ رہی ہے ابھی

تو جدا ہو کے بھی جدا تو نہیں
گھر میں خوش بو تری بسی ہے ابھی

تمھارے بس میں تو دو حرف بددعا کے ہیں
حریف سارے ہی منکر مگر خدا کے ہیں

طبیب سب جسے تریاق کہہ کے دیتے رہے
یہ سارے زخم بدن پر اُسی دوا کے ہیں

غضب کے تیر ہیں ترکش میں وہ بھی زہر بھرے
ستم گرو یہ قرینے تو کربلا کے ہیں

کبھی چراغ بجھائے کبھی عَلَم لہرائے
جو دیکھیے تو یہ سب شعبدے ہوا کے ہیں

جو منزلوں کے مقابل ہوں اُن پہ کیسے چلوں
یہ نقشِ پا کسی مغرور رہنما کے ہیں

ہمیں عزیز ہے اپنا پھٹا ہوا دامن
فقیر کب متمنی کسی عطا کے ہیں

بدل گئے ہیں بہت شہر کے حسیں باقؔر
گلاب رُو ہیں مگر حوصلے بلا کے ہیں

نہ پوچھ کیسے ہم اس شہرِ کربلا میں رہے
بس ایک زہر بھرا تیر ہر کمان میں تھا

رات سادہ ہے بہت درد نگارو آؤ
اب کوئی آگ ہی بھڑکاؤ شرارو آؤ

داغ ہی کچھ شبِ مشکل کی ردا میں لگ جائیں
جگنوؤ آؤ، چمکتے ہوئے تارو آؤ

ہوگیا ختم سفر، پھوٹ چکے ہیں چھالے
اب تو اے بخیہ گرو زخم شمارو آؤ

یونہی کیوں خلد میں جائیں، ہمیں لینے کے لیے
خوشبوؤ آؤ، گلو آؤ، بہارو آؤ

بیکرانی کی تمنا نے بکھیرا ہے اُسے
تم ہی سمجھاؤ سمندر کو، کنارو آؤ

دل کی دھڑکن کے سوا کون رہا ہے ساتھی
کیسی تنہائی ہے، اب تو مرے پیارو آؤ

آنکھوں میں کوئی سلسلۂ خواب تو آئے
سوکھے ہوئے دریاؤں میں سیلاب تو آئے

کچھ دن کے اُجالے کا بھی ہو جائے گا ساماں
راتوں میں کوئی صورتِ مہتاب تو آئے

نکلے ہیں بسیرے کو تو اُتریں گے پرندے
رستے میں کوئی منزلِ شاداب تو آئے

کر دیں گے فدا قافلۂ دل بھی مسافر
ایثار کے قابل کوئی محراب تو آئے

ملاح کے بازو کے بھی کھل جائیں گے جوہر
طوفان تو آئے کوئی گرداب تو آئے

رہے گا مجھ سے مسیحا مرا خفا کب تک
یہ دیکھنا ہے کہ ہوتی نہیں شفا کب تک

کوئی مَلَک بھی نہ آیا کہ بوجھ کم ہوتا
بلند ہاتھ اٹھائے رہے دعا کب تک

تمھارے پاس تو سامان سب ہوا کے ہیں
تمھارے ساتھ چلے گی مگر ہوا کب تک

فقط لبوں کی نہیں ہاتھ کی ضرورت ہے
کرو گے مکر کی صف سے مباہلہ کب تک

زمین پاؤں تلے سے نکلتی جاتی ہے
ہوا میں رہ کے کرو گے مقابلہ کب تک

گرا ہے جڑ سے اُکھڑ کر تو راستے سے ہٹاؤ
رہے گا پیڑ سڑک پر یونہی پڑا کب تک

نہ بادلوں کا بھروسا نہ موسموں کا یقیں
رہے گی برق سے روشن مگر فضا کب تک

تمام آنکھوں نے خاموشی سے دیکھا
ستم پھر سے شہیدوں نے سہا کیا

ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے بیابانوں میں
اب تو سونے کے بٹن بھی ہیں گریبانوں میں

ہوگئی سوکھے ہوئے کانٹوں کی ٹہنی زینت
خشک پھولوں کو سجانے لگے گل دانوں میں

سنگ دانوں سے نکلتے ہیں اُنھی کے موتی
گھونسلے جن کے بنے ہوتے ہیں ایوانوں میں

بے گل و برگ بہاروں کی شکایت کیسی
کیکٹس کس نے لگائے تھے گلستانوں میں

آسمانوں پہ کوئی اُن کا بھی حق ہے کہ نہیں
وہ پرندے کہ جو پیدا ہوئے زندانوں میں

سادہ لوحوں پہ گھما دیتے ہیں جادو کی چھڑی
کون سے جال بچھائیں گے پرستانوں میں

کل پھر اِک بزم میں اُس دشمنِ جاں کو دیکھا
سب سے بڑھ کر تھا معزز وہی مہمانوں میں

maablib.org

یہ کیا کہ حق ہو کسی کا مگر کسی کو ملے
شجر لگائے کوئی اور ثمر کسی کو ملے

کرم ہے سب پہ مگر کامیاب کوئی نہیں
فضا کسی کو ملی بال و پر کسی کو ملے

عجیب حال ہے اِس دور کے مکینوں کا
ملے ہیں بام کسی کو تو در کسی کو ملے

ہے رہبروں سے کہیں معتبر مرے نزدیک
وہ سنگِ میل جو وقتِ سفر کسی کو ملے

مری اُداس شبوں کا سلام کہہ دینا
وہ ماہتاب سا چہرہ اگر کسی کو ملے

عروسِ ماہ بھی سو جائے مہر بھی نہ اُٹھے
خدا کرے کہ نہ ایسی سحر کسی کو ملے

لوگوں نے اپنے نام کے پرچم اٹھا لیے
گلیوں کا جو بھی حشر ہو گھر تو سجا لیے

دیکھے کوئی دریچہ نشینوں کے حوصلے
منظر بدل گئے ہیں تو پردے گرا لیے

سر سبز باغ تیرے پرندوں کو کیا ہوا
کیوں سب نے دُور دُور بسیرے بنا لیے

ہیں مطمئن کہ ہو گی نہ طوفاں سے کچھ گزند
سر جب ہے ہم نے ریت کے اندر چھپا لیے

دشتِ ہوس کی گرم ہواؤں نے کس طرح
ہونٹوں سے رنگ آنکھوں سے منظر چرا لیے

رہبروں کے قافلے پر ناگہاں بجلی گری
آسماں والوں پہ زیرِ آسماں بجلی گری

خشک موسم میں کم از کم بام و در محفوظ تھے
مہرباں بادل جہاں پہنچا وہاں بجلی گری

جھونپڑا خس کا کسی اعزاز کے قابل کہاں
کوئی اونچی ہی عمارت تھی جہاں بجلی گری

اُس کے موسم کے مظاہر کب رہے ہیں معتبر
دیکھیے بادل کہاں گرجا کہاں بجلی گری

خاک پر بیٹھا تو پائے سبزہ و گل مہرباں
چل پڑا کوئی جو سوئے کہکشاں بجلی گری

اکتفا قطرے پہ کیوں ہو کیوں پیالا مانگیے
مانگنے کی شرط ہی ٹھہری تو دریا مانگیے

انتظارِ شوق میں جب آنکھ پتھرانے لگے
آئینے سے کوئی تحریکِ تماشا مانگیے

مٹی قدروں سے اُمیدِ رہنمائی ہے عبث
ڈوبتے خورشید سے پھر کیوں اُجالا مانگیے

عالمِ حرص و ہوس کا آئینہ خانہ ہے یہ
مانگیے کس کس جگہ سے اور کیا کیا مانگیے

محفلوں میں ہوگئی ہے کیا عجب شرکت کی شرط
داخلے سے قبل دربانوں سے چہرہ مانگیے

ملتے ہیں اب تو درد نئے غم نئے نئے
ہم کو تلاش کرنے ہیں موسم نئے نئے

تھیں ٹہنیوں پہ برف کے ہمراہ کونپلیں
دیکھے ہیں میری آنکھوں نے موسم نئے نئے

جاری اُدھر سے ہے نئے زخموں کا سلسلہ
ہم بھی اِدھر بناتے ہیں مرہم نئے نئے

ہے شہر کی زمین نئی آسماں نیا
سو ہم اُٹھائے پھرتے ہیں پرچم نئے نئے

پَر ہوں تو پھر فضا کی کوئی انتہا نہیں
ادراک ہو تو ملتے ہیں عالم نئے نئے

دیکھنا سونا جوانی کا نہ بچپن دیکھنا
کام آتا ہے کہاں جسموں کا آہن دیکھنا

سانحوں کو دیکھتے ہیں اس طرح اہلِ نظر
جیسے گہرے رنگ کے شیشے سے گرہن دیکھنا

جس کی جانب ساری دنیا کا کھچا جاتا ہے دل
اُس کی صورت دیکھنا اور اُس کا دامن دیکھنا

ہے ضعیفوں کے لیے کیا زندگی اِس شہر میں
گھر میں دن بھر بیٹھے بیٹھے خالی آنگن دیکھنا

آم کی ڈالی نہ جھولے اور نہ کوئل کی پکار
میری آنکھوں کو پڑا ہے کیسا ساون دیکھنا

تھا کبھی در کوئی ایسا نہ کوئی بام ایسا
کس دھماکے نے کیا شہرِ دل آرام ایسا

خوف سے لوگ سرنگوں میں سفر کرنے لگے
آگیا دہر میں پھر کون سا بہرام ایسا

مسجدیں، سونی ہیں، گھر سونے ہیں، گلیاں سونی
پہلے دیکھا کبھی منظر نہ سرِ شام ایسا

جھک کے خود پوششِ کعبہ نے بلائیں لے لیں
باندھ کر آئے تھے کچھ لوگ تو احرام ایسا

ذہن سے محو ہوئے جاتے ہیں خوابوں کے چمن
کس خرابے میں ملا ہے ہمیں آرام ایسا

ہم بدل دیں اگر اپنے در و دیوار کا رنگ
آپ ہی آپ بدل جائے گا بازار کا رنگ

دن ڈھلے جیسے کبھی دھوپ میں بارش ہوجائے
اِس طرح تھا ترے انکار میں اقرار کا رنگ

سبز سے سرخ کبھی اور کبھی سرخ سے سبز
کیا بدلتا ہے ترے شہر کے مینار کا رنگ

اپنے افکارِ پریشاں سے سجانے والو
کیا سے کیا ہوگیا دیکھو مری دیوار کا رنگ

ہوگئے کیا وہ ترے لطف و کرم کے جذبے
اُڑ گیا کیسے ترے درہم و دینار کا رنگ

عید اس بار منائی ہے کرسس کی طرح
ہم پہ بھی آگیا آخر ترے تہوار کا رنگ

اثر پذیر ہے جب سے وہ کوکبِ ثانی
نہ محفلوں میں مزہ ہے نہ لطفِ ویرانی

وہاں تو ابر بھی ہو جاتے ہیں خدا کہ جہاں
پہاڑ خشک ہوں اور کھیتیاں ہوں بارانی

بغیر ہاتھوں کی مخلوق ہو جہاں آباد
کہاں تک اس کی کرے گا کوئی نگہبانی

یہ مانتا ہوں کہ سیلاب تھا بلا کا مگر
بہا کے سب خس و خاشاک لے گیا پانی

پنپ رہا ہے اُجالوں میں سحرِ ابلیسی
بھٹک رہی ہے اندھیروں میں نسلِ انسانی

گھر بھی اِک آئینہ خانہ چاہیے
جس کو جگنو سے سجانا چاہیے

ہر اُفق پر جگمگانے کے لیے
چاند سورج کا گھرانا چاہیے

چار سُو خندق ہو اور خندق میں آگ
اب تو ایسا آشیانہ چاہیے

چہرۂ روشن خیالی کے لیے
کچھ ادائے باغیانہ چاہیے

کرلیا گھر پر نیا پرچم بلند
اب الگ قومی ترانہ چاہیے

خواہشیں اتنی بڑھیں آخر کہ اب
ہم کو قاروں کا خزانہ چاہیے

کس طرح کہہ دوں کہ دستِ بے ہنر اچھا رہا
سانحہ یہ ہے کہ وہ بد تھا مگر اچھا رہا

سنگ زن بستی میں طوفانی ہوا کے دشت میں
جس پہ کوئی پھل نہ آیا وہ شجر اچھا رہا

چلتے چلتے ہی سہی دیکھا تو چشمِ خلق نے
بن گیا جو نقش بھی دیوار پر اچھا رہا

ہے کہیں تیروں کی بارش اور کہیں لیزر کے جال
ایسے عالم میں تو ہر بے بال و پر اچھا رہا

ہم تو منزل کی تمنا میں بھٹکتے ہی رہے
وہ جو بے منزل تھا اُس کا ہر سفر اچھا رہا

مارتا ہے ڈنک عقرب بن کے کربِ آگہی
اہلِ دانش سے تو بے خواب و خبر اچھا رہا

شہر کو رونق دی اپنے گھر کی ویرانی سے
کیسی مشکل حل کردی کتنی آسانی سے

سورج کی کرنوں کا گلہ کیا، آگ سے کیا شکوہ
اکثر چھالے پڑ جاتے ہیں ٹھنڈے پانی سے

ہم ہی ہمیشہ کام آئے ہیں، آج بھی حاضر ہیں
پھول اگر بچ جائیں کانٹوں کی قربانی سے

اندر کا روپ اور ہے جن کا، باہر سے کچھ اور
من کے عیب چھپاتے ہیں تن کی عریانی سے

زہر دیا ہوتا تو کم از کم صبر تو آجاتا
ہم کو تو مارا یاروں نے میٹھے پانی سے

ہوتا گر محنت کا پسینہ تارے کا ہم سر
ٹوٹ چکی ہے کاہکشاں میری پیشانی سے

کتنی راحت پہنچاتا ہے تن کو گھور اندھیرا بھی
سورج سورج کرنے والو تم نے سو کر دیکھا بھی

موسم کی بے رحم ہوا سے باغ جلیں تو حیرت کیا
فصل بہا لے جاتا ہے جب میرا اپنا دریا بھی

پھول کھلیں تو کھلتے جائیں آگ لگے تو لگتی جائے
خود قسمت کے پھیر میں شاید ہے قسمت کا تارا بھی

اتنے دن سے سیج سجائے بھگل بنائے بیٹھے ہو
کوئی تمھیں پیغام بھی آیا کوئی فرشتہ اترا بھی

تھوڑا تھوڑا روز سفر بازار کا بڑھتا جاتا ہے
مشکل ہوتا جاتا ہے کچھ اپنے گھر کا رستہ بھی

سب آرائش کی چیزیں موجود تو ہیں گھر میں پھر بھی
ایک سنہری مچھلی بھی ہو اِک رنگین پرندہ بھی

جس نے بچا رکھا تھا اب تک بڑھتے جنگل سے ہم کو
پتھر کی دیوار بھی گم ہے غائب ریت کا صحرا بھی

سوچو تو بے وقت کی نعمت بھی زحمت بن جاتی ہے
نیند میں ڈوبی آنکھوں پر ہوتا ہے قہر اُجالا بھی

خون سے لکھ کر ایک عریضہ باقرؔ نے بھی بھیجا تھا
تم نے کھول کے دیکھا بھی ہے دیکھا تو کچھ سوچا بھی

ہو رہے ہیں اب ہواؤں میں بھی یارانے نئے
دیکھیے بنتے ہیں کیسے کیسے ویرانے نئے

ایک باقرؑ کے قلم کو کون پوچھے گا، جہاں
نوکِ نیزہ سے لکھے جاتے ہوں افسانے نئے

سوچیے تو کون دے سکتا ہے اس شاطر کو مات
جو بنا لیتا ہے ہر بازی میں کچھ خانے نئے

کھینچ کر لے آئی ہیں واپس قفس کی راحتیں
ورنہ یہ پانی نیا ہے اور نہ یہ دانے نئے

کس کو کس کو پوچھیے، کس کس کا پیچھا کیجیے
روز گلیوں میں نظر آتے ہیں دیوانے نئے

جھیلیے دھوپ کبھی جایئے طغیانی میں
جوہر انسان کے کھلتے ہیں پریشانی میں

جوش میں آئے تو پیاسوں کو بہا لے جائے
یہی پانی ہے تو پھر آگ لگے پانی میں

مجھ پہ اے بادلو، اِک بار برس کر دیکھو
کیسے گل زار چھپے ہیں مری ویرانی میں

بھولے چہرے پہ سجائی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا
ڈھونڈھ اُس کو جو چھپا رکھی ہے پیشانی میں

گھر میں اِک پھولؔ کی ٹہنی بھی نہ رکھنا ورنہ
رکھ دیے جاؤ گے موسم کی نگہبانی میں

مہرباں ہم پہ بہت گردشِ حالات ہوئی
رات اپنے ہی ستارے سے ملاقات ہوئی

پھول اِس بار مرے باغ میں آئے تھے بہت
کیا اِسی وجہ سے بے وقت کی برسات ہوئی

مل گیا اُس کے سمندر سے ہمارا دریا
خوف جس بات کا ہم کو تھا وہی بات ہوئی

کتنی اُمید لگائی تھی نئے موسم سے
پھر وہی دھوپ ہوئی، شام ہوئی، رات ہوئی

لطف تو یہ ہے کہ اِس بار بھی جیتا موسم
سب سمجھتے ہیں ہمیں جیت، اُسے مات ہوئی

کام آئے گی یہ تھوڑی سی دھنک ہی لے جاؤ
پھر نہ کہنا کہ نہ خاطر نہ مدارات ہوئی

زندگی بھر کی رفاقت بھی ہے ایسی جیسے
اِک مسافر کی مسافر سے ملاقات ہوئی

maablib.org

خود صدف سے نہ گئے اپنے ہی گوہر رکھے
ہم نے سوکھی ہوئی آنکھوں میں بھی کنکر رکھے

نام لکھ جاتا ہے اپنا مری پیشانی پر
جس نے جس نے مری بنیاد میں پتھر رکھے

شہرِ ساحل کی حدوں میں وہی رہ سکتا ہے
جس کو طوفان کہے، جس کو سمندر رکھے

جس میں ہو جاتا ہے لوگوں کا بڑا دستِ سلام
ہم نے اس حال میں بھی ہاتھ برابر رکھے

حیف! راغب نہ ہوا کوئی بھی دیمک کے سوا
جب صحیفے ترے جزدان سے باہر رکھے

کوئی دیکھا نہیں اس کے قد و قامت جیسا
زیب اُسی کو ہے کہ نام اپنا صنوبر رکھے

گل سے تشبیہ کچھ اُس کے لیے اعزاز نہیں
وہ جہاں زیب بہاروں کو بھی نوکر رکھے

اب ہے شاہی بھی رعایا کے کرم پر باقر
تاج پہنا کے بٹھائے کہ کھلے سر رکھے

maablib.org

پانی پر چلنے کی دُھن میں ہم غرقاب ہوئے
جب ہم ڈوب چکے تب سب دریا پایاب ہوئے

اُس پر خاک کے بادل بھیجو اُس کو ہی گہناؤ
جس سورج سے کرنیں لے کر تم مہتاب ہوئے

چاند کی مٹی دھرتی سے بھی بے رونق نکلی
چکنا چور ہمارے کیسے کیسے خواب ہوئے

پانی کی مذموم ہوس میں مچھلی بن گئے لوگ
اچھے خاصے شہر نہ جانے کیوں تالاب ہوئے

کیا کہنا اس آبِ رسانی کا باقر جس میں
پھول تو سارے سوکھ گئے کانٹے سیراب ہوئے

مہکتی راتیں دیں، موسم دیے، زمانہ دیا
تمھی کہو کہ محبت نے تم کو کیا نہ دیا

نفس نفس پہ لگائی تھی اتنی پابندی
تو کیوں مزاج ہمیں ایسا عاشقانہ دیا

سدا سُکھی رہیں وہ ہاتھ بھی جنھوں نے کبھی
ہماری پشت کو اِک درسِ تازیانہ دیا

ہم اُن کے جبر کے ممنون ہیں جنھوں نے ہمیں
نئے سفر کے سوا کوئی راستہ نہ دیا

ہزار سحر کے امکان تھے مگر ہم نے
نئے دیے کے عوض دے دیا پرانا دیا

فقط وہ لوگ ہی مجرم نہیں جو ظلم کریں
یہ دیکھنا ہے کہ کس نے اُنھیں بہانہ دیا

کب شکایت کی کہ ہم اِس دہر میں تنہا چلے
ہم چلے، سورج چلا، طوفاں چلے، دریا چلے

روندتا پھرتا رہے شہروں کو پر وہ تیز رَو
کم سے کم اپنے محلّے میں تو آہستہ چلے

کون اب پوچھے گا مٹی کی ٹھیکریوں کو بھلا
آج کل بازار میں چاندی چلے سونا چلے

ہے زمیں پر ہر طرف قانونِ فطرت کی نفی
آسماں میں حضرتِ خاکی کا سیارہ چلے

کیا ضروری ہے کہ ہو ہر باپ کی خواہش یہی
جس ڈگر پر میں چلوں اُس پر مرا بیٹا چلے

پیروی کی ہے کبھی تو ایسے بندوں کی فقط
قصد اُن کا جس طرف ہو اس طرف کعبہ چلے

زمیں پہ کوئی ٹھکانا، نہ آسمان میں تھا
وہ ساری عمر ہی شیلاک کے مکان میں تھا

بس ایک در تھا جسے رہزنوں نے دیکھ لیا
نہ کوئی راستہ اس کے سوا مکان میں تھا

وہ پتھروں کا خدا کوہِ نور بن نہ سکا
اگرچہ صدیوں تلک کوئلے کی کان میں تھا

نہ پوچھ کیسے ہم اُس شہرِ کربلا میں رہے
بس ایک زہر بھرا تیر ہر کمان میں تھا

ہوا کسان جو آزاد، ہوگیا بے دخل
بچا وہی جو زمیں‌دار کی امان میں تھا

پلٹ کے آئے مسافر تو شہر تھا خالی
بس ایک ڈھیر سا چنوں کا ہر مکان میں تھا

کچھ تازہ گل نہیں تو کوئی خار ہی ملے
جاتی ہوئی بہار کا اِک تار ہی ملے

اب چلتے چلتے دھوپ کے بھی تھک گئے ہیں پاؤں
کچھ دیر کو سہی کوئی دیوار ہی ملے

لگتا ہے جیسے شہر میں رہتا نہیں کوئی
ہم جس طرف گئے ہمیں بازار ہی ملے

کچھ کیجیے کہ بند دکانوں کے مال کو
گاہک نہیں تو رہزنِ بازار ہی ملے

کیا مرحلے بھی ہوتے ہیں آسان واقعی
ہم کو تو سارے راستے دشوار ہی ملے

سب رنگ و بو تو ساتھ اڑا لے گئی ہوا
ہم کو فقط بہار کے آثار ہی ملے

کب تک رہے گی بارِ سماعت یہ خامشی
مژدہ نہیں تو لذتِ انکار ہی ملے

مرہم کا کام کرتا ہے نشتر کبھی کبھی
اب شاخِ گل نہیں کوئی تلوار ہی ملے

چرچا بہت سنا ترے دستِ شفا کا تھا
جتنے ہمیں ملے ترے بیمار ہی ملے

چاہت تو درکنار نہ پرسش نہ رسم و راہ
اب سوچتے ہیں تم ہمیں بے کار ہی ملے

آسائشوں کے شور میں سن ہو نہ جائے جسم
کچھ زخم ہی سہی کوئی آزار ہی ملے

راہبوں کی ہی خبر ہے نہ مسیحاؤں کی
گھنٹیاں اونگھتی رہتی ہیں کلیساؤں کی

ابرِ رحمت کوئی برسے کوئی طوفاں آئے
منتظر سوکھی ہوئی ریت ہے دریاؤں کی

ہم نے دیکھا کہ عجب قحط پڑا ہے اَب کے
اُس جگہ بھی جہاں بہتات ہے دریاؤں کی

نوجواں مارے گئے جنگ میں بیٹے جن کے
دوستو تم کو دعا چاہیے اُن ماؤں کی

حکمرانی کے لیے عقل ضروری تو نہیں
بھیڑ لگ جاتی ہے اِک آن میں داناؤں کی

کیوں پسند آئے اُنھیں سونے کے پنجرے باقرؔ
راس آتی تھیں فضائیں جنھیں صحراؤں کی

زینتِ روزن و آرائشِ در کیا ہوگی
کوئی سورج ہی نہ ہوگا تو سحر کیا ہوگی

نقش بجھ جائیں گے خاصانِ تماشا کے بغیر
یہ شفق چہرہ یہ مہتاب نظر کیا ہوگی

ہے سرابوں کی جھلک اور نہ میلوں کے نشاں
ایسے حالات میں تحریکِ سفر کیا ہوگی

حوصلہ جن میں نہیں ضربِ ہوا سہنے کا
ایسے اشجار کو توفیقِ ثمر کیا ہوگی

چشمِ بے نور پہ رنگوں کا اثر کیا ہوگا
بند کانوں کے لیے تازہ خبر کیا ہوگی

موسموں نے بھی ہمیں رنگ دکھایا اچھا
دھوپ لگنے لگی اچھی کبھی سایہ اچھا

گر گئے پیڑ مگر نکلیں زمینیں زرخیز
اَب کے دریاؤں میں سیلاب بھی آیا اچھا

ذرّے ذرّے میں رچا ہے مرے پُرکھوں کا لہو
میری پہچان ہے گھر میرا، برا یا اچھا

عقلِ ابلیس ہے اب عقلِ الٰہی بن کر
بھیج دنیا پہ کوئی قہر خدایا اچھا

میرے ہر خواب کی تعبیر بدلتی جائے
رنگ بن کر کوئی آنکھوں میں سمایا اچھا

کوئی آرام کی صورت نہ کوئی خواب آئے
دن میں سورج تو سرِ شام سے مہتاب آئے

اُس پہ اے گل تری نکہت کا اثر کیا ہوگا
جس کے گھر روز نیا عطر کا سیلاب آئے

ایک مدت ہوئی دریا کی صفائی کرتے
کم سے کم ہاتھ کوئی گوہرِ کم یاب آئے

سلطنت اُس کو ملے، تاج و جواہر اُس کے
میرے حصے میں فقط اِک پرِ سرخاب آئے

ڈال لو یاد کی زنبیل میں تم بھی، شاید
کام اِک روز ہمارا دلِ بے تاب آئے

مانا در و دیوار پہ جالا تو نہیں تھا
گھر میں ترے پر اتنا اُجالا تو نہیں تھا

ہم آئے تو ساتھ اپنے نئے رنگ بھی لائے
گلشن ترا کچھ ایسا نرالا تو نہیں تھا

سچ ہے کہ کمایا ہے بہت رزق یہاں سے
پر منھ میں مرے تیرا نوالا تو نہیں تھا

کل رات جلایا گیا اِک اور بسیرا
اُس گھر کا مکیں پھر کوئی کالا تو نہیں تھا

وہ صاحبِ قدرت بھی تھا مائل بہ کرم بھی
یہ پچھلے گناہوں کا ازالہ تو نہیں تھا

کچھ اَب کے بار تو سچ ہو گئے ہیں خواب مرے
کہیں کہیں پہ مہکنے لگے گلاب مرے

نظر سے سب کے جو تو نے چھپا کے رکھا ہے
وہ روپ مجھ کو تو دکھلا دے ماہتاب مرے

میں تشنگی کے سمندر میں اِک جزیرہ ہوں
یہ اور بات کہ رنگین ہیں سراب مرے

بہت طویل ہے مصری کی کشتیوں کا سفر
ستم یہ اُس پہ کہ طوفاں ہے ہم رکاب مرے

مسافرت میں نئے دشت کی بہت کام آئے
کہیں گناہ ترے اور کہیں ثواب مرے

مقبول ہیں مکتب میں کتابوں سے زیادہ
وہ نشے جو چڑھتے ہیں شرابوں سے زیادہ

تاریخ کے اوراق میں رہتے نہیں وہ لوگ
امید جو رکھنے لگیں خوابوں سے زیادہ

رہتے ہیں جو پانی کے تعاقب میں ہمیشہ
سیراب وہ ہوتے ہیں سرابوں سے زیادہ

بہتا ہے اگر تیرا بہاروں کے لیے خوں
مہکیں گے ترے زخم گلابوں سے زیادہ

تھی ہم کو بہت طبقۂ بالا سے توقع
پر لعل و گہر نکلے خرابوں سے زیادہ

کہتے ہیں کہ بے کار ہیں مزدور یہاں کے
ہیں عیش مگر اُن کے نوابوں سے زیادہ

اب نہ محفوظ ہیں جنگل ہی نہ آنگن اپنے
لوگ کمروں میں لگانے لگے گلشن اپنے

کون اب پاکی و ناپاکی کی اُلجھن میں پڑے
پھاڑ کر پھینک دیے لوگوں نے دامن اپنے

تجھ سے جیتے ہیں ترے ہجر میں مر جاتے ہیں
اے ہوا ہم کو کرا دے کبھی درشن اپنے

بیش تر شام و سحر پاس رہے جس کے رہن
کام آیا نہ کبھی وہ بھی مہاجن اپنے

شورِ دریا ہے کہانی میری
پانی اس کا ہے روانی میری

کچھ زیادہ ہی بھلی لگتی ہے
مجھ کو تصویر پرانی میری

جب بھی اُبھرا ترا مہتاب خیال
کھل اُٹھی رات کی رانی میری

بڑھ کے سینے سے لگا لیتا ہوں
جیسے ہر غم ہو نشانی میری

مہرباں مجھ پہ ہے اِک شاخِ گلاب
کیسے مہکے نہ جوانی میری

پھر ترے ذکر کی سرسوں پھولی
پھر غزل ہوگئی دھانی میری

کچھ تو اعمال برے تھے اپنے
کچھ ستاروں نے نہ مانی میری

لکھی جائے گی ترے برف کے نام
جو تمنا ہوئی پانی میری

تم نے جو بھی کہا میں نے مانا
تم نے اِک بات نہ مانی میری

مختصر بات تھی جلدی بھی تھی کچھ
اُس پہ کچھ زود بیانی میری

نہ جلتی ہے نہ جلنا چاہتی ہے
ہری ڈالی تو پھلنا چاہتی ہے

یہ مٹی بھی تو اب اپنی سیاہی
مرے چہرے پہ ملنا چاہتی ہے

بدل کر گھر بہت خوش ہو رہے تھے
سو اب صورت بدلنا چاہتی ہے

تو پھر شعلے کو کیوں الزام دیجے
کہ چاندی خود پگھلنا چاہتی ہے

چلاؤ تیر زہریلی ہوا کے
بہار اب خوں اُگلنا چاہتی ہے

نہ روحِ زندگی ہوتی ہے راضی
نہ جاں تن سے نکلنا چاہتی ہے

ہمیشہ خواب کو سمجھو نہ بے خبر لوگو
شعور و ذہن ہی ہوتے ہیں خواب گر لوگو

گھروں کو اپنے سجاتے رہے ہو سال بہ سال
کسی کو کوچۂ جاناں کی بھی ہے خبر لوگو

یہ قمقمے ہیں جو لٹکے ہوئے ہیں تاروں سے
کہ کشتگانِ وفا کے سجے ہیں سر لوگو

نشانِ جدّ وجہد وجہِ افتخار رہے
نہ ٹوپیوں میں چھپاؤ شگافِ سر لوگو

عجب! کہ لوگ جو مامورِ شہربانی ہیں
اُنھیں کے پاس نکلتے ہیں مال و زر لوگو

maablib.org

پگ پگ پھول کھلے تھے لیکن تن من میں تھی آگ
وہ تو ساتھ نہیں تھا لیکن ساتھ تھے اُس کے بھاگ

سوچ رہا ہوں کس کے وِش سے ہوگی کم تکلیف
چاروں اُور کھڑے ہیں میرے رنگ برنگے ناگ

دھیرے دھیرے من اگنی ٹھنڈی نہ کہیں ہوجائے
چھیڑ کبھی دل کی بینا پر کوئی پرانا راگ

میٹھے پانی کی ندی کیوں بہے سمندر اُور
جس کے من میں پیار کا دھن ہو کیوں لے وہ بیراگ

آج یہاں کل وہاں یہی ہے باقرؔ اپنا حال
ہر مٹی دھتکارے جب سے چھوٹ گیا پریاگ

دھرتی کے بیٹو بولو دھرتی ماتا کی جے
سندھ کی جے راوی کی جے جمنا گنگا کی جے

بھور کی جے سورج کی جے بھولے چندا کی جے
دھوپ کی جے بادل کی جے بہتے دریا کی جے

پیار کی جے پریتم کی جے کومل آشا کی جے
پھول کی جے خوش بو کی جے سوندھی پُروا کی جے

سندر سپنے والی راتوں کی بھی جے جے کار
جس میں دو پریتم ملتے ہوں اُس سنجھا کی جے

زہل پہ اُٹھنے والی تلواریں مردہ باد
گھاؤ کی ہے جے مرہم کی ہے جے گمنام دوا کی جے

کھلیانوں میں آگ لگانے والے مردہ باد
ہل کی جے ہرواہ کی جے گرتے میگھا کی جے

آپس میں لڑنے والی سینائیں مردہ باد
چکّی میں پسنے والی ، بھوکی جنتا کی جے

جنتا جس سے دُکھ پائے وہ نیتا مردہ باد
جو پرجا میں خوشیاں بانٹے اُس راجا کی جے

باقرؔ آؤ سب مل کر جگ میں آواز لگائیں
سچ کی جے، نیکی کی جے، جنتا سیوا کی جے

موتی موتی رنگ

پہلی اشاعت: ۱۹۹۷ء

maablib.org

احمد رشید

اور

عاشور کاظمی

کے نام

maablib.org

ترتیب

maablib.org

مرے قدم کی روانی یقیں کی راہ میں رکھ
مرے خدا مجھے تشکیک سے پناہ میں رکھ
میں ایک ذرّۂ بے مایہ، روشنی کا فقیر
زمیں کی اوٹ میں رکھ، چاہے مہر و ماہ میں رکھ
بدن کے ہر بنِ مو میں جلا دے آگ مگر
نہ اک شرر کی بھی گرمی مری کلاہ میں رکھ
مری پہنچ میں ہے جو کچھ تری امانت ہے
قمیصِ فقر میں رکھ یا قبائے شاہ میں رکھ
گناہ گار ہوں میزان میں نہ تول مجھے
کرم کی گود میں رکھ لطف کی نگاہ میں رکھ
گو ایک جَو کے بھی قابل نہیں مرے اعمال
کرم سے اپنے مجھے نعمتوں کی راہ میں رکھ
کوئی تو عذرِ اماں حشر کے لیے ہو مجھے
کوئی شرر ہی مرے نامۂ سیاہ میں رکھ

رہے خیال تری معرفت کی رفعت میں
جھکی جبین مری اپنی بارگاہ میں رکھ

اے قلم چل کہ ذرا مدحتِ مولا لکھوں
اپنے ہاتھوں سے میں دنیا ہی میں عقبیٰ لکھوں

روز مہکاؤں اُسی ذکر کی خوشبو سے دہن
نام سے اُس کے اندھیرے میں اُجالا لکھوں

میری قسمت کہ ہیں میرے کئی رشتے اُن سے
جد لکھوں، راہنما لکھوں کہ آقا لکھوں

یاد جب آتا ہے مہتاب دو پارہ ہونا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کیا لکھوں

maablib.org

ذرّہ ذرّہ ہے دو عالم کا قصیدہ اُس کا
اک قلم سے میں کہاں تک لکھوں کیا کیا لکھوں

لوگ کہتے ہیں محبت میں غلو کرتے ہو
جو سمندر ہو اُسے کیسے میں قطرہ لکھوں

فخر بے جا ہے جو ہے نور سے خلقت پہ تمھیں
کیوں فرشتو تمھیں ماتھے کا پسینہ لکھوں

کربلا سمجھو، نجف سمجھو، خراساں سمجھو
اپنی تحریر میں جب بھی میں مدینہ لکھوں

زندگی اُس کی غلامی کے لیے وقف رہے
موت کو اُس کی محبت کا نتیجہ لکھوں

میرے افکار ہیں سب اُس سے عقیدے کا صلہ
اپنے حرفوں کو اُسی علم کا صدقہ لکھوں

وارثِ علمِ لدنی ہوئی باقرؔ جو ذات
یہ شرف کم ہے کہ میں اُس کا قصیدہ لکھوں

اے کہکشاں نواز مقدر اُجال دے
میری طرف بھی ایک ستارہ اُچھال دے
ہم پورے آفتاب کے قابل نہیں اگر
تھوڑی سی پیلی دھوپ ہی آنکھوں میں ڈال دے
ہاں کہتے کہتے گنگ نہ ہو جائے دل کہیں
یارب مری زبان کو تابِ سوال دے
روگی ہوا ہے دھوپ کو ترسا ہوا بدن
اے مامتا سپوت کو گھر سے نکال دے
کوئی تو دوستوں سے مرے دوستی کرے
کوئی تو مہربان بلاؤں کو ٹال دے
تو لفظ گر تو ہے، تجھے شاعر کہیں گے جب
اک بے زبان حرف کو نغمے میں ڈھال دے
بجلی کا تیر جیسے دھنک کی کمان میں
کیا اور اس شباب کی کوئی مثال دے

باقرؔ اس آفتاب میں جوہر ہے اس قدر
آ جائے جوش میں تو سمندر اُبال دے

لڑکھڑاتی ہوا روز کہتی ہے کیا، شہر والو سنو
ایک پودا کوئی آج پھر جل گیا، شہر والو سنو

آگئے ریت کے ڈھیر دیوار تک بلکہ بازار تک
دشت کے ہاتھ لکھ دیں نہ پھر فیصلہ، شہر والو سنو

کیا ستم خیز اُجالوں سے اچھے ہمارے اندھیرے نہیں
جنگلوں نے تمھیں کیا نہیں کہہ دیا، شہر والو سنو

کوئی تم میں یزید اور شبیر ہے، کس کی تقصیر ہے
لوگ کہنے لگے شہر کو کربلا، شہر والو سنو

خاک منھ میں، مرے ہم پہ کیا کوئی تازہ بلا آئے گی
رو رہا ہے بہت دن سے کوئی ندا، شہر والو سنو

پھول بن کر کھلو، کوئی خوشبو بنو، کچھ مداوا کرو
کہہ رہی ہے فلک نارسیدہ دعا، شہر والو سنو

جھوٹ کی ٹہنی پہ سچ کا گل کھلا اللہ ہو
پائے مصنوعی پہ زخمِ آبلہ اللہ ہو

پھر اُسی کے پاؤں سے لپٹی ہے لیلائے بہار
اب کے موسم پھر ہمارا گھر جلا اللہ ہو

زہر ہو ناخن میں جن کے دوش پر تیر و کماں
زخم کی تشخیص اُن کا مشغلہ اللہ ہو

سوگ جاتی شام کا، پیارے نگاروں کا لہو
پھر زمیں نے اپنے چہرے پر مَلا اللہ ہو

اپنی آنکھوں پر بھروسا ہے نہ کانوں پر یقیں
میرے حق میں اور اُس کا فیصلہ اللہ ہو

غرقِ مے الفاظ جن کے لب ثنا خوانِ یزید
اُن نجس ہونٹوں پہ ذکرِ کربلا اللہ ہو

ایک جانب حکمِ حاکم اک طرف حبِ زمیں
سامنے ہے کتنا مشکل مرحلہ اللہ ہو

مجھ کو یہ عقبیٰ کے ٹھیکے دار جو چاہیں کہیں
یاعلیؑ کہنا ہے میرا مسئلہ اللہ ہو

چاہیے کیا اور باقرؔ اُس کے ہونے کا ثبوت
یہ زمیں، یہ چاند سورج، یہ خلا اللہ ہو

(مطلع کے قوافی ضرورتِ شعری کے تحت کھلے رکھے گئے ہیں)

اتنے برس کے بعد بھی دل بچگانہ کتنا ہے
اک دیوانے کے پیچھے دیوانہ کتنا ہے

سچ پوچھو تو سارے موسم کھیل ہوا کے ہیں
کس کو دینا کتنا ہے ترسانا کتنا ہے

یوں تو نہیں کہیں شمع کی لو خود ہی خطرے میں ہو
پروانے کے قالب میں پروانہ کتنا ہے

ڈھنگ سے ہم کوئی کام کریں گر کوئی ہمیں بتلائے
ساری عمر میں رونا کتنا گانا کتنا ہے

خوشبو کے پیکر میں چھپا کچھ بھی ہو سکتا ہے
رنگوں کی دنیا میں بھی ویرانہ کتنا ہے

جس رستے سے شام سویرے گھر اسکول گئے
آج وہی رستہ باقر اَن جانا کتنا ہے

چل رہے ہیں ایک ہی جانب کو دریا اور ہم
جیسے صرصر اور پتا، جیسے گرتا اور ہم

شہر بھر میں ایک بھی محفوظ چھت دیکھی نہیں
سر چھپاتے پھر رہے ہیں ایک چڑیا اور ہم

آب و گِل کی حکمرانی کی قبا کے واسطے
لڑ رہے ہیں کب سے اک ننگا فرشتا اور ہم

بے کراں ظلمات کی راتوں سے جیتیں گے بھلا
چند جگنو، ایک ننھا سے ستارا اور ہم

بھول بھی جاتے ہیں ہم دونوں کہ جانا ہے کہاں
اتنے بے خود مل کے ہو جاتے ہیں رستا اور ہم

جز اندھیرے کے نہ کچھ شب کے خزانے سے ملا
کتنا سکھ تجھ کو چراغوں کے بجھانے سے ملا

زر نگاری نہ بزرگوں کی پسند آئی مگر
کتنا زر اُن کی قباؤں کے جلانے سے ملا

دوستی کے نہیں قابل تو عداوت ہی سہی
سلسلہ کوئی تو شاہی کے گھرانے سے ملا

کس کو پہچانیے کس کس کے لیے غم کیجے
ایک انبار درندوں کے ٹھکانے سے ملا

پائے بازار نہ گلزار نہ سونا سی زمیں
جتنا احساس ملا صرف ترانے سے ملا

سر اُٹھانا تو کبھی راس نہ آیا باقرؔ
جو بھی اعزاز ملا سر کو جھکانے سے ملا

کہتی ہے زندگی کی رَو میرے لیے دعا کرو
ایک نہیں مرض ہیں سو، میرے لیے دعا کرو

ہم نے سنا ہے شمع کو کہتے ہوئے پتنگ سے
ٹکڑوں میں بٹ رہی ہے لَو، میرے لیے دعا کرو

میری رگوں کا جزر و مد، میرا نفس ہے چاندنی
چاند کی گھٹ رہی ہے ضَو، میرے لیے دعا کرو

درد کا دیو بے اماں، قلب نزار و ناتواں
ایک پہاڑ ایک جَو، میرے لیے دعا کرو

ایک طرف ہے زہرِ شب، اُس پہ ملال کا دھواں
جانیے کب پھٹے گی پو، میرے لیے دعا کرو

تھوک رہے ہیں خون اور کہتے ہیں بیچ آب سے
دجلہ، فرات اور نَو، میرے لیے دعا کرو

سن کے کراہ شہر کی آ تو گیا ہوں میں مگر
اے میرے دوستانِ نَو، میرے لیے دعا کرو

یہ بام نہیں تھے یہ در ایسے تو نہیں تھے
جب ہم تھے تو شام و سحر ایسے تو نہیں تھے

یہ کیا کہ خفا ہو تو اٹھا لیتے ہو خنجر
تم شوخ بہت تھے مگر ایسے تو نہیں تھے

لے جا کے اُسے بیچ سمندر میں اُڑاتے
مجبور پرندے کے پر ایسے تو نہیں تھے

دیکھو تو نظر تلخ، جو چکھو تو زباں تلخ
پھول ایسے نہیں تھے ثمر ایسے تو نہیں تھے

جس پیڑ پہ رہتے ہو اُسی پیڑ کو کاٹو
کیا ہوگیا، تم بے ہنر ایسے تو نہیں تھے

سورج کی جگہ شمع، سمندر کی جگہ نہر
تھے خوب مقدر مگر ایسے تو نہیں تھے

میری مٹی بچی مٹی، بچی مٹی سونا
باقی سب کچھ کنکر پتھر، یا پھر جادو ٹونا

یاد کرو کیا تم سے کہا تھا جب صحرا میں اُترو
ٹھنڈے ٹھنڈے باغ لگانا میٹھی فصلیں بونا

خود فہمی کے خول سے نکلو اصلی دنیا دیکھو
دیواروں پر پھول ہیں لیکن بنیادوں میں لونا

زمزم کے پنگھٹ پر جب بھی پہنچو حاجی صاحب
سب سے پہلے اپنے دل کے کالے دھبے دھونا

سات سمندر پار سے کس کے جسم کی گرمی آئے
کس خوشبو سے مہکے خالی گھر کا کونا کونا

بستے ہوں جس دیس میں سارے ہنستے چہروں والے
دیکھو صاحب اُس بستی میں اپنا دل مت کھونا

راتوں میں جب چھوٹے باقرؔ یادوں کی مہتابی
اُس کی خوشبو کی شبنم میں اپنا آپ بھگونا

سجا نہ جس پہ کبھی آدمی کا پیراہن
تمام شہر ہے پہنے اُسی کا پیراہن

ہتھیلیوں پہ اُٹھائے سزا کے انگارے
یہ کون مانگ رہا ہے خوشی کا پیراہن

خزاں خزاں ہی رہے گی ہزار رنگ بھرے
کبھی پہن بھی اگر لے کلی کا پیراہن

نہ جانے کب سے مرے جسم میں اندھیرا ہے
عطا ہو مجھ کو کوئی روشنی کا پیراہن

کشاں کشاں ہمیں پُرخار راہ سے لے چل
کہ چاک چاک ہو یہ بے حسی کا پیراہن

زباں ہے گنگ مگر انگ انگ بولتا ہے
فریب ہے کہ نہیں خامشی کا پیراہن

یہاں کی خوب ہوا تم کو لگ گئی باقرؔ
یہ عمر اور نیا عاشقی کا پیراہن

چاہے پھول کے چٹکی لے پتوں سے زور کرے
وہ موسم اچھا موسم جو من کو مور کرے
پیارے تُو بھی بالکل میرے دل جیسا نکلا
باہر سے خاموش لگے اندر سے شور کرے
رنگوں کے پردوں میں بھی پہچانا جائے گا
آنکھیں نیلی کر لے یا زلفیں گھنگھور کرے
پار سمندر کرنا بھی واپس بھی آنا ہے
ایسی ہوا میں مت اُڑنا جو پر کم زور کرے
ہم سنیاسی لوگ ہیں بابا دھن سے ہمیں کیا کام
چور کو جو سرکار کرے سرکار کو چور کرے
اور لکھے کو بتائیں ایسی "جاگیں" تیرے بھاگ
ساقیؔ☆ پیارے مالک تیری لمبی ڈور کرے

نام جپو نیلی چھتری والے کا میاں باقرؔ
چڑھتے دن کو سانجھ کرے جو رین کو بھور کرے

ساقی فاروقی۔لندن

کھیت سے بچ کر گزرے بستی کو ویرانی دے
وہ دریا کیا دریا جو ساگر کو پانی دے

شعر سنا کوئی ایسا جس سے لگے بدن میں آگ
نیند اُڑ جائے جس سے ایسی کوئی کہانی دے

سوکھ رہے ہیں باغ بغیچے، نہریں ریت ہوئیں
اے موسم کے مالک اک موسم بارانی دے

خود بنوائے محل دو محلے ہم کو سنائے حدیث
خود تو پہنے عبا قبا ہم کو عریانی دے

توڑ گئی دم آخر پیاسی رات اماوس کی
پیارے سورج اب تو اپنے چاند کو پانی دے

کون سنے گا تیرا قصہ رونے دھونے کا
لیلیٰ مجنوں شامل کر کوئی راجا رانی دے

اب تک تم نے باقرؔ ایسے کون سے کام کیے
کس اُمید پہ مالک تم کو نئی جوانی دے

لفظوں کی وحشی خوشبو سے اچھا نذرانہ کیا کرتا
کچھ شعر لکھے کچھ پھول چنے شاعر دیوانہ کیا کرتا

منظر بھی نیا، نشتر بھی نئے، نئے زخم لگانے والے بھی
مرے دل میں چھپ کر بیٹھ کوئی درد پرانا کیا کرتا

مٹی مٹی رقصندہ ہے کچھ لوگوں سے شرمندہ ہے
قبضے میں ہے ابنِ آدم کے گیہوں کا دانہ کیا کرتا

کیسے سمجھائیں کیوں ہم نے دُوری کے سمندر جھیلے ہیں
لاکھوں شمعوں کے جنگل میں تنہا پروانہ کیا کرتا

تم جو چاہو کرسکتے ہو، تقدیر سے بھی لڑ سکتے ہو
جب ہاتھ میں خود ہی جان نہ ہو خالی دستانہ کیا کرتا

دن بھر کی دہکتی دھوپ ڈھلے، کوئی آنکھ پہ ٹھنڈے خواب ملے
پھر شام سے ملنے کا باقرؔ کوئی اور بہانہ کیا کرتا

کھڑکیوں سے بھی اگر دھوپ نہ آئی ہوتی
ہم نے دن ہوتے ہوئے شمع جلائی ہوتی

اپنی آنکھوں کو اگر ہم بھی بچا لے جاتے
سانس لیتے ہوئے منظر سے برائی ہوتی

لوگ مرعوب بہت ہیں تری محرابوں سے
بیل ہی کوئی ستونوں پہ چڑھائی ہوتی

میری آنکھوں کے دریچوں میں کبھی رنگ اس کے
دل کی دیوار بھی کاش اُس نے سجائی ہوتی

ہم کو منظور نہ تھی قیدِ وفاداریِ شہ
ورنہ پیروں میں بھی زنجیرِ طلائی ہوتی

سارے تہوار گزر جاتے ہیں سُونے سُونے
یہ عمارت بھی کبھی تم نے سجائی ہوتی

کیوں نہ ہوں کافور آنکھیں کیوں نہ ہو نم آئنہ
عکسِ بے قد آدمی اور قدِ آدم آئنہ

دعویٔ جوہر ہے جن کو اُن میں جوہر ہے کہاں
در حقیقت ہے زیادہ زنگ اور کم آئنہ

تم ہماری گرد پونچھو ہم تمھیں صیقل کریں
رفتہ رفتہ دونوں ہو جائیں گے باہم آئنہ

تم اگر اُس کے مقابل کچھ نہیں تو کیا ہوا
ایک پل سورج کی ہو جاتی ہے شبنم آئنہ

دیکھنا چاہو تو آنکھوں میں بچی ہے کائنات
کور چشموں کے لیے ہے کاسۂ جم آئنہ

فکر چہرے کی لکیروں کی کرو باقرؔ میاں
دھیرے دھیرے ہو رہا ہے تم سے برہم آئنہ

دل کی طلب ہے پھول کا پیکر اُٹھا کے چل
حالات کہہ رہے ہیں کہ پتھر اُٹھا کے چل

سب جان لیں کہ ہمتِ پرواز اب بھی ہے
قیدِ قفس بھی ہو تو کٹے پر اُٹھا کے چل

کٹنے کو ہاتھ بھی ہیں پہ سر کی ہے بات اور
دستِ طلب بڑھا کے نہیں سر اُٹھا کے چل

جب تک کہ رہزنوں کے بھی شل ہو نہ جائیں ہاتھ
کاندھے پہ اپنے روز نیا گھر اُٹھا کے چل

کچھ کم ترے مزاج کی طغیانیاں تھیں کیا
کس نے کہا پلک پہ سمندر اُٹھا کے چل

کماں شکستہ ہے، ترکش میں بھی ٹھکانہ نہیں
وہ تیر کیا چلے جس کا کوئی نشانہ نہیں

تو پھر یہ عشق بھلا کیسے سرخ رُو ہوگا
ہمیں چھپانا نہیں اور انھیں دکھانا نہیں

یہ اشک ہی نہیں جذبات کے فرشتے ہیں
جو ہوسکے تو پلک سے انھیں گرانا نہیں

تم اپنے زلف کی خوشبو سنبھال کر رکھنا
کہ آج کل کی ہواؤں کا کچھ ٹھکانہ نہیں

دیا ہے ہر نئے موسم نے ایک درد نیا
پرانا زخم ہمارے لیے پرانا نہیں

ہمارا حق ہے کہ ہم کچھ کہیں، کہیں نہ کہیں
غزل ہماری کسی ملک کا ترانہ نہیں

جاتے جاتے بھولا بِسرا قرض اُتارا اُس نے بھی
میرے جلتے گھر پر پھینکا اک انگارہ اُس نے بھی

ہم نے بھی کچھ داغ سجائے اپنے جلتے ہونٹوں پر
ٹانکا اپنی پلکوں پر اک جھلمل تارا اُس نے بھی

کتنے رنگیں پھول اور پتھر پہلے ہی تھے گردش میں
میری خلا میں پھینک دیا ہے اک سیارہ اُس نے بھی

ہم بھی مست رہے کچھ اپنے کچے پکے شعروں میں
جھوٹے سچے قصے لکھ کر وقت گزارا اُس نے بھی

چڑھتے رنگ کے ساگر میں یوں ہی تو نہیں ہم کود گئے
ہم کو کیا تھا ہلکا سا اک سبز اشارہ اُس نے بھی

اپنی رُسوائی پر باقرؔ شاکی تھے تم اوروں کے
اپنے افسانے میں لکھا نام تمہارا اُس نے بھی

باہر نکلو موسم جھیلو آسمان کے نیچے
فصل کہیں بوئی جاتی ہے سائبان کے نیچے

مجنوں پیاسا، چڑیا پیاسی ہری ببول کی ڈالی
کس تقدیر کا پانی ہے اس ریگستان کے نیچے

چاند ستارے کیا ہوتے ہیں شبنم کیا کرتی ہے
ایک رات سو کر تو دیکھو آسمان کے نیچے

اوپر تیز ہوا چلتی ہے نیچے گہرا پانی
آگ کوئی روشن کرتا ہے بادبان کے نیچے

بھولی بھٹکی کوئی کرن، کوئی تازہ ہوا کا جھونکا
اِس امید پہ بیٹھا ہوں میں روشندان کے نیچے

ہنستی آنکھوں کے پردے میں چھپے ہیں کتنے آنسو
دُکھ کا ایک سمندر ہوگا اطمینان کے نیچے

شہر نیا تعمیر کیا آباد کیے ویرانے
کتنے کتبے دبے ہیں لیکن نئے لان کے نیچے

اُس پر بھی کچھ غور کرو کوئی کام کی بات ہو شاید
وہ جو خط رکھا ہے کب سے اُس گل دان کے نیچے

خوب نہیں ہے جانم باقرؔ اتنی آتش بازی
جگہ جگہ بارود بچھا ہے ترے مکان کے نیچے

کچھ سامنے ہوا ہے تو کچھ راز میں ہوا
آغازِ زندگی عجب انداز میں ہوا

کاٹے گئے گلاب، لگائے گئے گلاب
جو کچھ ہوا بہار کے اعزاز میں ہوا

جو فیصلے ہوئے پسِ پردہ اُسی کے تھے
اعلان جو ہوا مری آواز میں ہوا

جو معجزے ہوئے تری تخئیل میں ہوئے
جو سانحہ ہوا مری پرواز میں ہوا

وہ میری خلوتوں میں تھا دُوری کے باوجود
یہ معجزہ فراق کے آغاز میں ہوا

یہ بھی کیا ہجر کے ماروں کی پذیرائی ہے
عطرِ مہتاب لگائے ہوئے رات آئی ہے

رُوئے ہر گل میں مجھے اُس کی شباہت آئے
پھول جھوٹے ہیں کہ جھوٹی مری بینائی ہے

جزر و مد رنگوں کے دیکھو تو پریشان نہ ہو
اُس کی آنکھوں کی سمندر سے شناسائی ہے

کم سے کم اُس سے ترا وصل اُجاگر ہوتا
وہی تصویر جو میرے لیے بنوائی ہے

یوں بھی کیا ہوتا ہے اعلان شکستِ دل کا
تجھ سے بڑھ کر تو ستم گر تری شہنائی ہے

ہے حسیں اتنا ترا شہر کہ اس میں رہنا
ہم غریبوں کے لیے باعثِ رُسوائی ہے

ہزار بچ کے چلے ہر طرح سے دُور کیا
اُسی خیال نے دل میں مگر ظہور کیا

وہ میرے رنگ کا عادی میں اُس کی خوشبو کا
قیام ہم نے مگر کتنا دُور دُور کیا

بس ایک بار جھکایا تھا سر ترے دَر پہ
پھر اُس کے بعد تو ہم نے بہت غرور کیا

اُڑائے جاتے ہمیشہ پتنگ کی صورت
سلام اُن کو جنھوں نے ہمیں طیور کیا

بس اپنے دل کے خدا سے کلام کرتے رہے
اور اپنے خاک کے تودے کو کوہِ طور کیا

کٹھن دنوں میں بھی کیا کیا مزے کیے باقرؔ
ملا کے ذکر ترا غم کو بھی سُرور کیا

کرو کچھ اور قیامت کا انتظار ابھی
مری زمین کا اُجڑا نہیں سنگھار ابھی

عطا کیے ہیں بہت بے بسی کے دستانے
اُمید کتنی لگائے ہے شہریار ابھی

زمیں اگرچہ نئے قحط کی لپیٹ میں ہے
رُکا نہیں ہے مگر دستِ کردگار ابھی

چلو دعا کے چراغوں کی لَو بڑھاتے چلیں
ملیں گے اور بھی دشتِ سیاہ کار ابھی

ابھی سے کیسے شبِ ہجر کی سزا دے دیں
کہ اُس کی گود میں ہے شام کی بہار ابھی

قبا پہ رنگ پڑا ہے تو اتنی وحشت کیا
لباسِ جلد بھی ہونا ہے تار تار ابھی

غریب آنکھ کی پتلی کی ہمتوں کے نثار
ہوا نہیں ہے اندھیروں پہ انحصار ابھی

کوئی سنے نہ سنے تو سنائے جا باقرؔ
ترے ستار میں باقی ہے ایک تار ابھی

کون گیا مری پگڈنڈی سے پاؤں میں رنگ بھرے
آنکھوں میں پھر آئی چمک آشاؤں میں رنگ بھرے

کوئی کرن ہے سورج کی یا دھنک کا بادل ہے
آنگن کو کبھی دھوپ کرے کبھی چھاؤں میں رنگ بھرے

برہا کی وہ ٹھنڈی رُت وہ چاہت کی برسات
برف کرے پربت پربت دریاؤں میں رنگ بھرے

جادو جیسا نام سجن کا نشہ ہے پی کی یاد
ہونٹوں کی لالی بن جائے اداؤں میں رنگ بھرے

رنگ ہوئے بستی کے پھیکے، اُڑ گئی ہر خوشبو
ہے کوئی داتا آ کر جو مرے گاؤں میں رنگ بھرے

ایک پیالہ کڑوے رس کا کرے ہے کیا جادو
لغزش کو مستی میں بدل دے خطاؤں میں رنگ بھرے

یارو کوئی جتن کرو کہ جو پیارے بیٹوں کو
پلٹائے پردیس سے، سونی ماؤں میں رنگ بھرے

میں ہی کیا مری نسلیں بھی اس نام پہ واری جو
ہاتھ کو دے ہمت اُٹھنے کی دعاؤں میں رنگ بھرے

ایسے پیڑ کی سیوا کرنا پُن ہے بڑا باقرؔ
چار دِشا کو جو مہکائے ہواؤں میں رنگ بھرے

اُبھرتا چاند لکھیں گے، سنہرا خواب لکھیں گے
کتابِ دل کا اک دن پھر سے پہلا باب لکھیں گے

حیا آئی گر اپنی بے بسی کا ذکر کرنے سے
علامت کی زباں میں ماہیِ بے آب لکھیں گے

ہم اپنے زاغ کو طاؤس کہنے پر مُصر ہوں گے
تو سب تالاب کی چڑیوں کو بھی سُرخاب لکھیں گے

ہمارے ذہن زنگ آلود، دست و پا ہیں ناکارہ
ہم اب تاریخ زیرِ منبر و محراب لکھیں گے

کبھی تاریخ میں بے نام رہنا ہی بھلائی ہے
تمھارا ذکر لکھیں گے تو پھر قصاب لکھیں گے

ستونِ جسم پر میرے نئے زخموں کے ریشم سے
محبت کا ترانہ خود مرے احباب لکھیں گے

سب اُدھر بھاگیں جدھر سے تری خوشبو آئے
ہم کو ضد ہے ہمیں لینے کے لیے تو آئے

آ گئے سارے ہوا خواہ کمانیں لے کر
دشت میں رم کے لیے جب مرے آہو آئے

آبِ زر سے بھی کہیں پیاس بجھا کرتی ہے
کوئی دریا، کوئی تالاب کوئی جو آئے

ہم سے بنتیں نہیں لفظوں کی فصلیں کہ ہمیں
تجھ سا باتوں کا ہنر آئے نہ جادو آئے

→ فصیلیں

ہم سمجھتے ہیں نہ سمجھیں گے اشاروں کی زباں
آنکھ آئے کہ شکن آئے کہ ابرو آئے

اعتبار اُس کی قسم کا بھی نہ کرنا باقرؔ
کوئی ہاتھوں میں اگر لے کے ترازو آئے

کوئی بے کل خوشبو روح میں ہے کوئی سوچ آوارہ دل میں ہے
اک چاند ادھورا چہرے پر اک کچا تارا دل میں ہے

کسی یاد کی گرمی سے اُچھلے، کسی پیار کی خوشبو سے مہکے
اسے خون کہوں یا شعر کہوں یہ جو اک فوّارہ دل میں ہے

مٹی تو مری ہے پریاگی، پر دھوپ لگی ہے مہرانی
گنگا جمنا مری آنکھوں میں اور سندھ کا دھارا دل میں ہے

مرا جسم ہے سونے چاندی کا مرا برف نگر میں ہے ڈیرا
مگر ایک خلش ہے سینے میں ابھی اک انگارہ دل میں ہے

یوں جلتی دھوپ کے صحرا میں خاموش کھڑا ہوں میں جیسے
دریا ہوں میں ٹھنڈے پانی کا اور برف کا پارہ دل میں ہے

یہ خانہ بہ سر تو موسم موسم آتے جاتے رہتے ہیں
کئی موسم دل پر ٹوٹ چکے مگر اک بنجارہ دل میں ہے

تم سبزے کے متوالے تھے، تم چاند ستارے والے تھے
پھر شام ہے کیسی چہرے پر کیسا اندھیارا دل میں ہے

بستی سے نکل آئے ہو مگر مجنوں بننا آسان نہیں
کوئی سودا سر میں ہے، کوئی بے چین شرارہ دل میں ہے

وہ ہنستے بستے دل والا باقرؔ کہ ہوا شاعر جب سے
منظر کے ہیں ناوک آنکھوں میں اور دُکھ کا آرا دل میں ہے

چمن سے دُور ہوا کی امان سے باہر
کیا ہے ہم نے بسیرا اُڑان سے باہر
گھروں میں گھس کے ہوا توڑ پھوڑ کرتی رہی
کھڑی تھی دھوپ مگر سائبان سے باہر
وہ ہم ہی تھے جو ہوا میں چراغ لے کے چلے
قدم ہمیں نے نکالے مکان سے باہر
پڑی ہیں ہاتھوں میں عہدِ دعا کی ہتھکڑیاں
وگرنہ ہم بھی گئے تھے مکان سے باہر
تمہارے شہر سے اچھا ہمارا جنگل ہے
ذرا نکل کے تو دیکھو مچان سے باہر
بچھڑ کے تم سے تو ہم ایسے ٹوٹ پھوٹ گئے
شکستہ تیر ہو جیسے کمان سے باہر
وہ خواہشوں کا سمندر زبان سے عاری
وہ پورے چاند کا منظر بیان سے باہر

عطا ہوئی ہمیں باقرؔ لبوں کی آزادی
پہ ایک لفظ نہ نکلا زبان سے باہر

کالی راتوں کے شہزادے جب بھی موج میں آئیں گے
چڑھتے چاند کو گالی دیں گے سورج کو جھٹلائیں گے

جو کچھ بھی ہوں جیسے بھی ہوں ہم بس پیار کے بادل ہیں
جتنی چاہو آگ لگاؤ ہم پانی برسائیں گے

ان کی محبت میں جس پر ہونا ہوگا مصلوب ہمیں
روز اُس پیڑ کو پانی دیں گے اُس کی خیر منائیں گے

رس برساتی رُت ہو یا اُڑتے پتوں کی ویرانی
جنگل جنگل ناچیں گے ہم بستی بستی گائیں گے

اپنی ساکھ بنانے کو یا اپنا جرم چھپانے کو
عود و عنبر چھڑکیں گے ڈھیروں صندل جلوائیں گے

تم نے دھوئیں کے پردے میں جب اپنا آپ چھپایا ہے
اپنی بستی کی خندق میں ہم بھی آگ جلائیں گے

کارِ دنیا کے لیے بے کار ہونا چاہیے
خوار تو کم ہے ذلیل و خوار ہونا چاہیے

تا کہ ساحل پر بنے گھر تک بڑی لہریں نہ آئیں
اب سمندر میں بھی اک دیوار ہونا چاہیے

نذر لینے کے لیے اور حکم دینے کے لیے
ہم ہوئے حاکم تو اک دربار ہونا چاہیے

کون کہتا ہے کہ قتلِ خلق ہے فعلِ عبث
خوب ہونا چاہیے سرکار ہونا چاہیے

سر جھکانا ہو جہاں اُس در سے کرتے ہیں حذر
گر پڑے اُس پر جہاں انکار ہونا چاہیے

ہو بہت آساں تو خود رہرو کو آجاتی ہے نیند
راہ کو تھوڑا بہت دشوار ہونا چاہیے

گھونٹ بھر آبِ مُصفّا کے لیے اس شہر میں
شہ نہیں تو شہ کا رشتے دار ہونا چاہیے

پیر بننے کے لیے یا پیش امامی کے لیے
جُبّہ ہونا چاہیے، دستار ہونا چاہیے

کب تک اہلِ فکر کب تک بندگلیوں کا سفر
آپ کو تو رونقِ دربار ہونا چاہیے

ڈوبے ہیں خمارِ وصل میں ہم، ہم کو بھی کبھی بیدار کرو
اک گرم نظر ہو ہم پر بھی، ہم کو بھی کبھی بیمار کرو

موجیں اُلجھیں طغیانی میں رہ جائیں بھنور حیرانی میں
تلوے بھی نہ بھیگیں پانی میں یوں بھی تو نہ دریا پار کرو

جب مٹی جھوٹی ہوتی ہے خود بیج کو بھی کھا جاتی ہے
گر سچی فصل اُگانی ہے سچی مٹی تیار کرو

ہر موڑ پہ سجدہ خانہ ہے، اصنام ہیں ہر چوراہے پر
اقرار تو بے حد آساں ہے، ہمت ہے تو پھر انکار کرو

اس شہر میں باقرؔ ہم نے یہ دستور انوکھا دیکھا ہے
اپنی مشکل آساں کرلو، سب کا جینا دشوار کرو

بھلے زمیں پہ نہ لگتے نہیں اگر رہتے
تو کیا ہم اُن کے لیے جا کے چاند پر رہتے
کہیں جو گرم ہواؤں کا بس چلا ہوتا
ہمارے باغ کے سب پیڑ بے ثمر رہتے
کوئی تو پیار کے دامن میں بھر کے لے جاتا
زمانہ ہوگیا ہم کو اِدھر اُدھر رہتے
ہوا میں جھومتی سرسبز ڈالیاں ہیں بہت
پرند خوب نہیں لگتے طاق پر رہتے
جو سیکھ لیتے خلا میں بھی تیرنے کا ہنر
تو ہم بھی چاند ستاروں کے ہم سفر رہتے
نکال لیتے ہم اُن میں بھی لطف کے پہلو
اگر فراق کے لمحات مختصر رہتے

ہمیں قبول ہے باقر گناہِ بے خبری
ثواب کتنا کماتے جو باخبر رہتے

آیا نہ نظر انھیں دھواں تک
شعلے تو گئے تھے آسماں تک

ہے ساری خدائی ہی برہنہ
پھولے گی کپاس بھی کہاں تک

ڈھونڈے ہیں کچھ ایسے بھی ستارے
گھبرائی پھرے گی کہکشاں تک

کس کام کے ایسے بانجھ بادل
رہتیں نہیں جن میں بجلیاں تک

اے آبِ جمالِ روئے یوسف
ہے تیری تلاش میں کنواں تک

ہم اُن کے قصیدے پڑھ رہے ہیں
پہنچے نہ جو ذائقے زباں تک

مٹی کو بھی پوجنے لگا ہے
انسان بھی گر گیا کہاں تک

در پہ صبح و شام سجدہ کر ہمارے ہاتھ چوم
چاہیے گر آشتی آ کر ہمارے ہاتھ چوم

اُس نے کی ہے پیار کی چوری تو اُس کے ہاتھ کاٹ
خوں کیے ہیں ہم نے بحر و بر ہمارے ہاتھ چوم

کاشت کاری تیری قسمت، ہم ہوئے جاگیردار
تو سپاہی ہے تو ہم افسر، ہمارے ہاتھ چوم

پیر پشتینی ہیں ہم، اپنی طریقت ہے نجات
سُرخ رُو ہوگا سرِ محشر ہمارے ہاتھ چوم

مرتبہ کیا پوچھتا ہے ہم ہیں علّامہ نصیب
پاؤں تک ہیں زینتِ منبر ہمارے ہاتھ چوم

آب و دانہ بھی ہے قبضے میں ہمارا گھر بھی ہے
طائرِ بے منزل و بے پَر ہمارے ہاتھ چوم

میر و غالب مر چکے، باقی تو سب ہیں گھاس پھوس
حرف کے اب ہم ہیں پیغمبر ہمارے ہاتھ چوم

خوں بھرے، گندے، نجس تھے ہاتھ لوگوں کے مگر
ہر کوئی کہتا ملا باقرؔ ہمارے ہاتھ چوم

پیاری تیری خوشبو ہوگی اچھی رنگت ہوگی
تیز ہوا سے یاری کر لے تری شہرت ہوگی

پاؤں بھی اندر ہاتھ بھی اندر بس اک چہرہ باہر
ہم کو کیا معلوم تھا اُس کی اتنی قامت ہوگی

خوشبو، رنگ، ہوا، پانی، اور ہیرا موتی دنیا
یہ دنیا بھی دوزخ ہے تو کیسی جنت ہوگی

آگ ملی تھی تم لوگوں کو آسائش کی خاطر
جنگل بستی پھونکو گے تو کتنی راحت ہوگی

جتنا اونچا نام ہے اتنی بُری ہے اپنی حالت
میرے گھر میں چور آئے تو مجھ کو خفت ہوگی

بہت بلندی سے پستی کا نظارہ مت کرنا
میناروں پر چڑھنے والو تم کو حیرت ہوگی

اس مٹی سے اُس مٹی اور اُس کے بعد سمندر
ساری عمر بسر کیا یونہی ہجرت ہجرت ہوگی

کیسے چھپے گی راز کی خوشبو چلتی ہوا سے باقرؔ
بھولی چڑیوں کے ہاتھوں جب خط و کتابت ہوگی

کوئی زندگی کی جھلک نہیں کہیں روشنی کا پتا نہیں
یہ ہوائے تُند کرے گی کیا کسی گھر میں کوئی دیا نہیں

میں اسی زمین کا پوت ہوں تو یہ غیریت کا سلوک کیوں
میں کہیں خلا میں اُگا نہیں، کسی آسماں سے گرا نہیں

یہ جو چلتے پھرتے بشر ہیں سب انھیں بُت کہو تو غلط نہیں
کسی چشم میں کوئی نم نہیں، کسی لب پہ کوئی دعا نہیں

تری بستیاں تو الگ رہیں ترے جنگلوں کا یہ حال ہے
کسی شاخ پر کوئی پھل نہیں، کسی گھونسلے میں بَیا نہیں

یہ عجیب ڈھنگ کا شہر ہے، یہ سکونِ دل ہے کہ قہر ہے
کسی دوستی میں غرض نہیں، کسی دشمنی میں جفا نہیں

مرے پارسا یہ بتا، تجھے میں برا کہوں کہ بھلا کہوں
ترے وصل میں کوئی غم نہیں ترے ہجر میں بھی مزہ نہیں

دو دن سکھ سے جینا ہو تو مانو میرا کہنا
کچے ساحل پر مت بسنا کشتی میں مت رہنا

دیکھ ہمارے ہاتھ ہیں خالی پاؤں بھی خالی خالی
خود پہنے ہے سونا چاندی ہم کو بھی کچھ پہنا

تم بھی دیکھو ہم بھی ڈھونڈیں ملنے کے کچھ رستے
ہم دونوں کو جانے کب تک ہے اس شہر میں رہنا

تیرا آنا جانا موسم، چھونا جیسے شبنم
رنگ ہوں جیسے پیر کے دھوون خوشبو جیسے گہنا

پاؤں تلے کی سوکھی مٹی نعمت سمجھو باقرؔ
اونچی نیچی لہروں پر آسان نہیں ہے بہنا

ہیں تو باقرؔ آپ میں جوہر بہت　　آپ باہر کم ہیں اور اندر بہت

ہم اگر زندہ جزیرہ ہوں تو کیا　　چار سُو گہرا تو ہے ساگر بہت

ہاں اُجالوں کے برہنہ شہر میں　　کام آئی نیند کی چادر بہت

دل یہ کہتا ہے اسی جانب چلیں　　آئے ہیں جس سمت سے پتھر بہت

شہر اندھا ہو بلا سے آپ کی　　روشنی ہے آپ کے اندر بہت

ساقیِ بارش سے پیتے ہیں روز　　سلسبیل و زم زم و کوثر بہت

آدمی ملتے ہیں لیکن خال خال　　گھومتے ہیں گرد کے پیکر بہت

ہیں خود اپنے دیس میں جو اجنبی　　ہیں سمندر پار ان کے گھر بہت

خواب میں دیکھی گلابی چاندنی
رات سے بے چین ہے باقرؔ بہت

رستہ نہیں دریا کو سمندر کے علاوہ
گھر کوئی بھی اپنا نہیں اس گھر کے علاوہ

کس طرح میں اس کو بھی کرائے پہ اٹھا دوں
کیا اور مرے پاس ہے اک سر کے علاوہ

واجب ہے سخن بھی کبھی زخموں کی زباں سے
کچھ لوگ تو سنتے نہیں نشتر کے علاوہ

رکھتے ہو فلک بوس پہاڑوں سے محبت
کیا اور ملے گا تمہیں پتھر کے علاوہ

دنیا سے تو مل جائے گی باقرؔ تمہیں ہر چیز
عزت نہ ملے گی کہیں اُس در کے علاوہ

سوچو کوئی ترکیب علاج اور شفا اور
یارو مرے زخموں کو دکھاتی ہے دوا اور
ہم نے تو ترے شہر میں اب تک یہی دیکھا
لگتی ہے کہیں آگ تو چلتی ہے ہوا اور
مٹی کو ضرورت تھی کسی اور نمک کی
فصلوں پہ چھڑکتے رہے ہم لوگ دوا اور
افکار و حکایات کے اُکتائے ہوئے ہیں
باتیں کرو کچھ دیر یونہی بے سروپا اور
پودا تری مٹی کا پنپنے کا نہیں ہے
موسم ہے یہاں اور زمیں اور فضا اور
ہوتے ہیں بہت ظلم بہانے سے خطا کے
بجلی کا نشانہ تھا کوئی اور جلا اور
ہم ڈھونڈ ہی لائے تری رنگوں کو دھنک سے
مل جائے کہیں سے تری خوشبو کا پتا اور

باقرؔ کہیں یونہی نہ گزر جائیں یہ بادل
بارش کے لیے مانگیے تھوڑی سی دعا اور

پھینکا ہوا گل بھی ترا پتھر کا مزہ دے
وہ بات بھی کہہ ڈال جو خنجر کا مزہ دے

دریا کو کھنگالوں بھی تو کچھ ہاتھ نہ آئے
اک اشک کو چکھوں تو سمندر کا مزہ دے

لٹ جائے نہ بے چارا مسافر تو کرے کیا
پردیس کی ہر چیز اگر گھر کا مزہ دے

پھولوں سے بھری سیج کو تو اپنے لیے رکھ
یوگی ہوں مجھے کانٹوں کے بستر کا مزہ دے

بتلا دے کس چلتی ہوئی راہ پہ اک دن
آنکھوں کو دھڑکتے ہوئے منظر کا مزہ دے

اُڑتے ہوئے گر جاؤں، سنبھل جاؤں، اُڑوں پھر
پرواز کبھی ٹوٹے ہوئے پَر کا مزہ دے

پھر دیکھیں گے ہم بھی تری ایماں طلبی کو
اک بار تو اللہ تجھے زر کا مزہ دے

اے کاش میں باقرؔ کبھی وہ شعر بھی لکھوں
احساس کو جو زم زم و کوثر کا مزہ دے

عجب ظلم باغوں پہ ڈھانے لگے
پھلی ٹہنیوں کو جلانے لگے

ہمیں ایک کونپل میں موسم لگا
وہ اک رات میں پیڑ اُگانے لگے

بہت سنگ دل ہو گئے دیوتا
سو ہم موم کے بت بنانے لگے

اُٹھائے تھے جس پر قیامت کے غم
اُسی پشت پر تازیانے لگے

اُنھیں کس قدر دھوپ اچھی لگی
بھری دوپہر میں نہانے لگے

وہ سب راز اک بات میں کھو دیے
سمجھنے میں جن کو زمانے لگے

اُدھر سُوئے مقتل چلا آفتاب
ستارے اِدھر سر اُٹھانے لگے

کہاں سے وہ باقرؔ نیا شہر ہے
ہمیں سارے منظر پرانے لگے

maablib.org

بہت بڑا نہیں گھر، کھڑکیاں کشادہ نہیں
ہمارا پھر بھی سفر کا کوئی ارادہ نہیں

خدا کا شکر کہ اب تک تو نبض چلتی ہے
لہو بہا تو ہے لیکن بہت زیادہ نہیں

وصال و ہجر کی روداد کس جگہ لکھوں
مری کتاب کا کوئی ورق بھی سادہ نہیں

بس ایک خاک کی چادر ہے اور نحیف بدن
قبا نہیں، کوئی طرّہ نہیں، لبادہ نہیں

تمھیں چمکنے کا حق کس طرح ملے گا بھلا
تمھارا چاند ستاروں کا خانوادہ نہیں

بس اک قلم ہے تو دو چار لفظ چند خیال
میں کاخ و کو نہیں رکھتا، میں شاہزادہ نہیں

یہ سب زمین کے بوسوں کے زخم ہیں باقرؔ
تمام دشت ہیں ہم سا کوئی پیادہ نہیں

وہ سدا کا تلخ لب میٹھی خبر دینے لگا
گویا اک سوکھا شجر تازہ ثمر دینے لگا

دھوپ کے نیزوں سے یا ملتی نہ تھی جائے پناہ
یا تو اب سایہ ہی سایہ ہر شجر دینے لگا

پھیر کر منہ اشقیا بھی رو پڑے اک بار جب
کاٹ کر ٹانگیں کوئی اذنِ سفر دینے لگا

توڑنے کے بعد بازو نوچنے کے بعد پَر
مہرباں ہو کر مجھی کو میرے پَر دینے لگا

اس سے اچھا اور کیا ہوگا کسی دُکھ کا علاج
ہم کو اپنے دُکھ ہمارا چارہ گر دینے لگا

ایک مٹی کا دیا بھی جس کی کُٹیا میں نہ تھا
سب کو اب تحفے میں وہ شمس و قمر دینے لگا

چُلّو بھر پانی میں باقرؔ ڈوب کر مر جائیے
سب کو تلقینِ ہنر اک بے ہنر دینے لگا

چاہ کر بھی تجھے ہم تیرے شناسا نہ ہوئے
جرم یہ ہے کہ ترے شہر میں پیدا نہ ہوئے

یوں بھی گردن زدنی تھے کہ بہت بولتے تھے
اس پہ یہ بھی کہ تیرے واسطے رُسوا نہ ہوئے

تشنہ رکھنا، کبھی بستی کو بہا لے جانا
یعنی بس قہرِ خدا ہوگئے دریا نہ ہوئے

پھول سے رنگ ہوئے، رنگ سے خوشبو میں ڈھلے
رُوپ بدلے ہیں بہت پھر بھی تماشا نہ ہوئے

ایسے دیوانوں کے قدموں کو زمیں چومتی ہے
بستیوں میں جو رہے صدقۂ صحرا نہ ہوئے

کوچے کوچے میں جو پھیلے رہے خوشبو کی طرح
تیرے باقرؔ ہے تو وہ راز بھی افشا نہ ہوئے

دعا تو دور رہی وہ تو بددعا بھی نہ دے
جو بس چلے تو ہمیں سانس بھر ہوا بھی نہ دے

جلا دیے تو پر و بال کیمیا نکلے
کہیں وہ راکھ سمجھ کر اسے اُڑا بھی نہ دے

میں دشمنی اسے سمجھوں کہ دوستی جانوں
وہ اپنے گھر سے نکالے بھی راستہ بھی نہ دے

ہرے بھرے ہوئے پانی کی دوستی میں بہت
کہیں وہ جوش میں آ کر تمھیں بہا بھی نہ دے

یہ آگ آج تو گلزار بن گئی ہے مگر
خزاں کے بھیس میں آ کر کبھی جلا بھی نہ دے

کھڑا ہوں ایسی عدالت کے سامنے باقرؔ
جو فردِ جرم لگائے بھی فیصلہ بھی نہ دے

بجھے دل کھل اُٹھیں جس سے وہ جادو لے کے آئے گا
نیا موسم نئے پھولوں کی خوشبو لے کے آئے گا

ملے فتراک میں خود اُس کی کچھ سر، ہم تو سمجھے تھے
ہمارا سورما کوئی ترازو لے کے آئے گا

روش بدلی نہیں اپنی جو مٹی کے فرشتوں نے
فلک اک بار پھر کوئی ہلاکو لے کے آئے گا

اُٹھے گا حشر کے دن اور بھی اِک حشر جب کوئی
ردائیں اور بُریدہ دست و بازو لے کے آئے گا

اسی کے نام ہوگی کاروانِ شب کی سرداری
اندھیری شب میں جو آنکھوں کے جگنو لے کے آئے گا

ہمیں معلوم ہے باقرؔ جو اک دن ہونے والا ہے
ہماری پشت ہوگی اور وہ چاقو لے کے آئے گا

جذبات کے بحرِ منجمد میں پھر کیسا اُبال آ گیا ہے
شاید کوئی دل کے آسماں پر سورج کی مثال آ گیا ہے

جب ہم نے دریچے اپنے کھولے جب ہم نے کی روشنی کی خواہش
خورشید کو نیند آ گئی ہے مہتاب میں بال آ گیا ہے

پھر دشت میں مشقِ رم کریں گے تلووں کو لہو سے نم کریں گے
اے عہدِ شباب دیکھ آ کر پھر کوئی غزال آ گیا ہے

کھیلی ہے جو موسموں سے ہولی خوشبو سے بھری ہوئی ہے جھولی
پیروں میں رچے ہیں عود و عنبر چہرے پہ گلال آ گیا ہے

سرگوشی میں تتلیوں سے پوچھا کلیوں کو گلے لگا کے دیکھا
جس کا نہ ملا جواب کوئی ایک ایسا سوال آ گیا ہے

ہے کوئی جو ضد کی برف توڑے، ٹوٹے ہوئے آئینے کو جوڑے
وہ اپنی جگہ اڑا ہوا ہے، ہم کو بھی جلال آ گیا ہے

اے مست ہوا میں اُڑنے والے آزاد زمیں پہ چلنے والے
ہر گام پہ دام بچھ گئے ہیں، ہر پیڑ پہ جال آ گیا ہے

مانا کہ کٹھن بہت ہے موسم، لمبا ہے سفر بہت تو پھر کیا
دنیا تو رواں دواں ہے باقرؔ کیا تم پہ زوال آ گیا ہے

نذرِ پروین شاکر

رنگِ غازہ روئے "خوشبو" سے اُڑا چاہتا ہے
دیکھیں کیا اور ابھی دستِ قضا چاہتا ہے

برگِ خوش رنگ بچے دستِ خزاں سے کتنے
شاخِ "صد برگ" سے پھر کوئی گرا چاہتا ہے

حیرتی ہیں کہ جو ہم کو عجمی گردانے
"خود کلامی" کا وہی ہم سے صلہ چاہتا ہے

اُجرتِ عجز بہت، قیمتِ اقرار بہت
حرفِ "انکار" بھی ہمت کی جزا چاہتا ہے

دیکھ اے چشمِ فلک دیکھ کہ اک "ماہِ تمام"
نور اپنا کسی سورج سے جدا چاہتا ہے

مرے دل کا، مرے تن کا، مرے جذبوں کا نچوڑ
بن کے قطرہ مری آنکھوں سے گرا چاہتا ہے

پھول اُس کے لیے اُس کے لیے اے نخلِ "مراد"
جو ہمیشہ تری شاخوں کو ہرا چاہتا ہے

باقرؔ افسوس کہ جسمِ مہ و پروین خصال
دیکھتے دیکھتے مٹی میں ملا چاہتا ہے

ہو کے خوش پہنے نہیں چنگاریوں کے ہار کب
آگ دی تم نے تو جلنے سے کیا انکار کب
برف میں لپٹے ہوئے شہروں کے چُپ ماحول میں
گل کھلائے گی تمھاری گرمیِ گفتار کب
منتظر بیٹھے ہیں سب ہی اپنے اپنے بام پر
پھر گزرتا ہے اِدھر سے ابرِ گوہر بار کب
آشیاں جلتے رہے، سیلاب بھی آتے رہے
بادلوں کی فوج سے چھینے گئے ہتھیار کب
لٹ کے آئے تھے کبھی اب لوٹ کر لے جائیں گے
پھر سجاؤ گے تم اپنے کوچہ و بازار کب
صرف میٹھے بول سے ہوتیں نہیں حل مشکلیں
قند کی کشتی میں ہوسکتا ہے دریا پار کب

ہم نے کب رکھی توقع آپ سے انصاف کی
ہم نے اپنی بے گناہی پر کیا اصرار کب

کیسا کیسا آدمی دنیا کے مے خانے میں ہے
کوئی پیمانے کے باہر کوئی پیمانے میں ہے

ٹوٹ کر گل دان میں سجنے سے مر جاتا ہے پھول
زندگی تو شاخ پر کھلنے بکھر جانے میں ہے

کیسے کیسے رُوپ بھر لیتا ہے پانی کا بدن
کیا مزہ اے برف گرمی سے پگھل جانے میں ہے

چل گیا ہے دیکھ کیسی چال شاطر آسماں
تیرے خانے کا ستارہ اب مرے خانے میں ہے

کوئی طائر لوٹ کر پھر اپنے گھر جاتا نہیں
جانے کیسی خاصیت اس کھیت کے دانے میں ہے

راس اُسی کو آئے گی باقرؔ ہوا کی دوستی
جس کا سارا حسن خوشبو بن کے لہرانے میں ہے

کسی قیمت پہ تو ہم تم کو منانے سے رہے
اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹانے سے رہے
دوستی کی ہمیں خواہش تو بہت ہے لیکن
ہم فقط اپنی ہی دیوار گرانے سے رہے
تم تو ہر روز بدل لیتے ہو نقشہ اپنا
روز ہم اک نئی تصویر بنانے سے رہے
کتنے دن رکھے گا اوروں کا اُجالا روشن
چاندنی کے لیے ہم چاند پہ جانے سے رہے
بن بتائے ہی جو رُخ اپنا بدل دیتی ہوں
ہم پتنگ ایسی ہواؤں میں اُڑانے سے رہے
ہاتھ بھٹکا تو لگا تیر ہمیں کو آ کر
ہم جہاں بھی رہے نزدیک نشانے سے رہے
کیا ہوئے رنگِ مہ و سال چھڑکنے والے
تیرے ہمراہ جو خوشبو کے زمانے سے رہے
لمحۂ غم ہی تو ہوتا ہے ہمارا اپنا
ہم کسی اور کو اُس وقت بلانے سے رہے

اب تو پیروں سے جڑیں بھی نکل آئیں باقرؔ
اب تو ہم اور کسی دشت میں جانے سے رہے

کاغذ پر آڑی ترچھی دو چار لکیریں کھینچ
چھوٹے موٹے لفظوں سے لمبی تحریریں کھینچ

پھولوں کی تصویرکشی تو سب کر لیتے ہیں
ہمت ہو تو جلتے سورج کی تصویریں کھینچ

آخر ہم دونوں کی اپنی اپنی ہے پہچان
ہم لے آئیں خشک گلے اور تو شمشیریں کھینچ

جھنکاروں سے شرکاروں کی نیندیں تو اُڑ جائیں
ٹوٹ نہیں سکتیں تو کم سے کم زنجیریں کھینچ

سچائی کو جھٹلا دینے کے ہنگاموں میں
جھوٹے خوابوں سے ہی کچھ کچی تعبیریں کھینچ

اچھا ہوا کہ ساتھ تمھارے نہیں گئے
ہم بے سبب ہی راہ میں مارے نہیں گئے

قائم رہا اُنھیں سے بہاروں کا سلسلہ
جو گل کبھی شجر سے اُتارے نہیں گئے

پائی ہے غسلِ شب سے یہ تابندگی یہ رُوپ
یونہی بلندیوں پہ ستارے نہیں گئے

زرخیز ہو رہی ہے زمیں اُس طرف جدھر
سیلابِ بے پناہ کے دھارے نہیں گئے

بھٹکا کیے تلاشِ گہر میں بہت مگر
چھوٹے سمندروں کے کنارے نہیں گئے

کہاں کی لفظ گری، کیسے شاعرانہ رہے
وہ جس کو شام و سحر فکرِ آب و دانہ رہے

ڈرے گا کیا ستمِ برقِ آسمانی سے
وہ جس کا تار پہ بجلی کے آشیانہ رہے

ہے ڈھلتی عمر میں یہ غسلِ آفتابی کیا
تمام عمر تو تم زیرِ شامیانہ رہے

انھیں کے ہاتھ لگی شہر کی نگہبانی
جو اپنے گھر میں رہے بھی تو مجرمانہ رہے

کوئی تو زخم شکایت کے واسطے رکھوں
کوئی تو ان سے ملاقات کا بہانہ رہے

رہے گی کیا یہی اک میل جول کی صورت
مری جبیں رہے اور تیرا آستانہ رہے

عجب پھیکی لبِ دنیا کی لالی ہوتی جاتی ہے
سحر پیلی ہوئی اور شام کالی ہوتی جاتی ہے

خفا رنگوں کی پچکاری نظر آتی ہے ہولی سے
دیے کے نام سے بدظن دِوالی ہوتی جاتی ہے

سمندر کی طرح آتی تھیں پورے چاند کی راتیں
مگر اب وصل کی شب بھی ہِلالی ہوتی جاتی ہے

ہوا ہے حملہ آور جب سے اک لشکر اُداسی کا
ہمارے کام کی ہر شے زوالی ہوتی جاتی ہے

بدلتا جا رہا ہے طرز کچھ داغِ یتیمی کا
نشانِ بیوگی چہرے کی جالی ہوتی جاتی ہے

دواتوں میں یہ کس نے بھر دیا تیزاب چپکے سے
قلم کی نوک اب اپنی جلالی ہوتی جاتی ہے

لکھوں کیا اور باقرؔ حضرتِ خالد کی رحلت☆ پر
یہ دنیا چاہنے والوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

☆ (انور خالد، ایڈیٹر روزنامہ "آواز" لندن کی وفات پر)

مایوسی کی جھیل میں بھی خوشیوں کا پرندہ اُترے گا
رات پھر افشاں چھڑکے گی پھر دن کا سونا چمکے گا

وحشت کے ہنگاموں میں طائر بھی چپ ہو جاتے ہیں
سننے کا ماحول کرو تو ذرّہ ذرّہ بولے گا

پگ پگ روکا جاتا ہے ہر آنے جانے والے کو
جیسے وہ گلیوں میں بکھرے ہیرے موتی چن لے گا

دُور دُور سے سوکھے پتے جلسہ کرنے آتے ہیں
چوراہے پر آگ لگے گی اور بگولا ناچے گا

جس کا زور چلا اُس نے ہی گھولا زہر سمندر میں
دیکھیں اب زہریلا بادل کس کے گھر پر برسے گا

اُس سے ہاتھ ملا کر باقرؔ ہم کیسے مفلوج ہوئے
اُس کی قربت ہے اب دیکھیں کس کا نصیبا پھوٹے گا

دانہ دُنکا، مونگے موتی جس جس کے دامن میں تھے
رنگ برنگے پنکھ پکھیرو سب اُس کے آنگن میں تھے

پیار کی رُت کہتے تھے جس کو، پوجا کرتے تھے جس کی
کیسے کیسے داغ لگے اُس موسم کی اُترن میں تھے

سچ پوچھو تو اُن سے ملن کی رات ملن کی رات نہ تھی
وہ بھی کچھ بکھرے بکھرے تھے ہم بھی کچھ اُلجھن میں تھے

پھولوں جیسا کومل مکھڑا، چکنا خوشبودار بدن
جیسے کنول کے پھول سے نکلے، جیسے وہ چندن میں تھے

چاند کو سورج کہلایا اور کالی رات کو اُجلا دن
دیکھا باقرؔ کتنے جادو اُس کے کالے ذہن میں تھے

جس دن سے اُس نے اپنا آنچل لہرانا چھوڑ دیا
بادِ صبا نے بھی گلیوں میں آنا جانا چھوڑ دیا
ویرانے ویران ہوئے اور دودھ کی نہریں خواب ہوئیں
دیوانوں نے بھی اپنا انداز پرانا چھوڑ دیا
پھولوں سے رنگوں سے کھیلیں یا نظاروں کو ترسیں
موسم کی راہوں میں ہم نے آنکھ بچھانا چھوڑ دیا
کس کی کس کی فکر کریں اور کس کو کس کو سمجھائیں
ہم نے تو خود اپنے دل کو بھی سمجھانا چھوڑ دیا
ہم پر ہی کیوں لگتی ہے ساری تہمت ہشیاری کی
اُس نے بھی تو اب اپنی زُلفیں بکھرانا چھوڑ دیا
اُس دن ایک کرن کو ہم سے باتیں کرتا دیکھ لیا
اُس کے بعد سے چاند ستاروں نے اِترانا چھوڑ دیا

خشک آنکھیں مفلس سی لگتی ہیں باقرؔ پھر بھی ہم نے
تیری خاطر اشکوں کا اَن مول خزانہ چھوڑ دیا

روکیں گے حملۂ عدو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے
ہوں بھی تو ہوں لہو لہو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے

لمس میں کیا سُرور ہے، ضبط کے کیا اصول ہیں
دونوں کریں گے جستجو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے

سجدۂ شر نواز سے یارو کہیں بلند ہے
ایک قیامِ بے وضو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر

شہر کشیدہ ہو تو ہو، گھر میں فساد ہے تو کیا
آؤ چلیں کنارِ جو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے

اہلِ چمن کو ہے فقط ایک چلن میں عافیت
بادِ نسیم ہو کہ لُو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے

جنگ و جدل کے باوجود مجھ کو یقیں ہے ایک دن
خلق پھرے گی کو بہ کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے

زر و بلور کے پیالے بہت ہیں
ہمیں تو ہاتھ کے چھالے بہت ہیں

بہت پیاسی ہے اے بے داغ مٹی
یہ بادل تو مگر کالے بہت ہیں

ہوائے شہر بھی تازہ نہیں کچھ
کچھ اُس نے روگ بھی پالے بہت ہیں

چھتیں ہوتی ہیں عالی شان اونچی
تری چھت میں مگر جالے بہت ہیں

تم اپنے بام و در کی خیر مانگو
مری کُٹیا کے رکھوالے بہت ہیں

نہ شاد ہو کے نہ دل کی مراد پا کے ملا
مزہ تو اُس کے مقابل شکست کھا کے ملا

میں اُس کے جسم کی خوشبو کے انتظار میں ہوں
وہ جب ملا کوئی خوشبو نئی لگا کے ملا

یہ انکسار کہ وہ خود کو خاک کہتا ہے
ہمیں تو جب بھی ملا ساتھ میں ہوا کے ملا

وہ جس کو دل میں سجا کر بھی ہم رہے بے چین
سکون اُس کو ہمیں خاک میں ملا کے ملا

ترے طفیل بجھی شام کے پیام آئے
اُداس چاند بھی اک بار مسکرا کے ملا

بدن کے سرد اندھیرے بھی جگمگا اُٹھے
عجب سُرور نئی دھوپ میں نہا کے ملا

ہمارے بعد تمہارے ہی کام آجاتا
سوائے راکھ کے کیا شہر کو جلا کے ملا

بلند ہوگئے آثار باریابی کے
وہ ایک نام اگر بیچ میں دعا کے ملا

تصویر

کچھ دن سے یہ عالم ہے میرا
جب بھی کچھ کھانے بیٹھتا ہوں
مرے آگے رکھے برتن میں
ایک قحط کے مارے بچے کی
تصویر اُبھرنے لگتی ہے
پھر میرا گلا رُندھ جاتا ہے
میں دسترخوان سے اُٹھ جاتا ہوں

maablib.org

رشتہ

گنگا دیس میں بچپن گزرا
گنگا ماں کہلائی

سندھ نگر میں ہوش سنبھالے
سندھ کو باپ کہا

اب ہے ٹیمز کنارے ڈیرا
ٹیمز سے رشتہ کر

maablib.org

بیٹے کا نوحہ

بعد تیرے میرے جینے کی دعا مانگے گا کون
رات بھر میرے سرہانے بیٹھ کر جاگے گا کون

اتنے دن کے بعد بھی تیرے لیے بچہ تھا میں
لڑکھڑاتا دیکھ کر میری طرف بھاگے گا کون

کون دے گا آگ کو اِسپند میرے نام کی
بارِ منّت کے عَلَم کی چوب پر ٹانگے گا کون

جب ستائے گی بہت مجھ کو زمستانی ہوا
اپنے بالوں سے دُلائی کو مری تاگے گا کون

کون سچّی ہوگا اب میرے دُکھوں کی آگ پر
درد کی دہلیز اب میرے لیے ناگے گا کون

سو گئی باقرؔ تری ماں خود اندھیری قبر میں
تیری راتوں کے لیے اب چاندنی مانگے گا کون

جلوس

خموش آنکھوں میں شہرِ بابل کے
سارے منظر اُبھر رہے ہیں
عَلَم سے ٹکرا کے ڈوبتے مہر کی شعاعیں
جھپکتی آنکھوں کے قرینوں پر
شفق کی سُرخی بکھیرتی ہیں
کشادہ رستوں پہ دونوں جانب
قطار اندر قطار
پتھر کے سر بریدہ مجسّمے ہیں
عمارتوں کے اُداس روزن
تماشیوں کی تالیوں کو ترس رہے ہیں
سڑک کی دو رویہ کیاریوں کے
تمام پودوں تمام پھولوں کو
مست اونٹوں کے نرم پنجے کچل چکے ہیں
فضا میں رہوار کے پسینے کی بو بسی ہے
ہوا میں بارود کی ملاوٹ ہے
طبل کی دل ہلانے والی دھمک سے
سارا خموش منظر دہل رہا ہے
جلوسِ بختِ نصر رواں ہے

قتل

سارے ایوان کے

مرد نامرد تھے

کوئی سیزر نہ تھا

اک قلوپطرہ تھی

جو تائید کا تاج پہنے ہوئے

گھن لگے تخت پر جلوہ گر تھی

ایک خنجر کو چلنا تھا سو وہ چلا تو مگر

سامنے کوئی سیزر نہ تھا

اور قلوپطرہ قتل کر دی گئی

شہر کا رنگ بدلا نہیں

پھر قلوپطرہ دفن کر دی گئی

کوئی رویا نہیں

maablib.org

آج

مجھ کو خود ہی خبر نہیں کیسے
پڑ گئی ہے عجیب عادت سی
چاہتا ہوں کہ روز کچھ آئے
دوستوں کا، کسی عزیز کا خط
گیس، بجلی کا، ٹیلی فون کا بل
کوئی پرچہ، کوئی رسالہ ہو

کچھ نہ آئے تو ایسا لگتا ہے
جیسے اس صبح پو پھٹی ہی نہیں
جیسے سورج نکل نہیں پایا
آج پھر صبح منتظر گزری
آج پھر ڈاکیہ نہیں گزرا
آج پھر کوئی خط نہیں آیا
آج پھر دن اُداس گزرے گا

کیوں

میں بچہ تھا
مرا دل جان سے پیارا سنہرا سنگِ مرمر کا کھلونا
ساتھیوں نے توڑ ڈالا... میں نہیں رویا

مجھے دریا کی لہریں چومتی تھیں
سبز پیلے کھیت میرا دل لبھاتے تھے
وہ میری مشک و عنبر سے مہکتی سرزمیں
ماں باپ نے جب جوشِ ہجرت میں چھڑائی... میں نہیں رویا

میں لڑکا تھا
مجھے جنگل میں تنہا بے سہارا چھوڑ کر
دنیا سے میرا باپ رخصت ہوگیا تھا... میں نہیں رویا

میں بھوکا تھا
شکم کی آگ سے مجبور ہو کر
نیم کے برگد کے پھل بھی کھائے پھر بھی... میں نہیں رویا

میں زندہ ہوں
میں اچھا ہوں، مگر میری
سدا کی خشک اور بے رنگ آنکھیں خوں شدہ کیوں ہیں
کوئی بتلاؤ
آخر آج میری آنکھ سے اک خون کی دجلہ رواں کیوں ہے

maablib.org

آخر کیوں

میرے لان کی گھاس
روز رات میں بڑھ جاتی ہے
رات میں ہی ہر گھاس بھلا کیوں بڑھتی ہے
کیا سورج سے ڈرتی ہے

میری منڈیر کی سبز چنبیلی
کانٹوں بھری دیوار پہ
اندھیارے میں سیڑھی چڑھتی ہے
رات میں بیل بھلا کیوں چڑھتی ہے
کیا سورج سے ڈرتی ہے
میرے گھر پر اوس کی برکھا
شام ڈھلے سے چپکے چپکے برتی ہے
پھول پات میں بستی ہے
رات میں اوس بھلا کیوں پڑتی ہے
کیا سورج سے ڈرتی ہے

سورج سے ہم سب ڈرتے ہیں
آخر کیوں

کہیں ذہن سو نہ جائے

نہ چلے زمیں تو کیسے
نبِ ختمِ تیرگی سے
کوئی شاخِ نور نکلے کوئی آفتاب پھوٹے

یہ تمام رنگ و نکہت یہ تمام زندگی جب
حرکت سے ہے عبارت
تو چلو اُٹھو کہ ہم بھی

کہیں کھیت ناچیں
کبھی ڈال ڈال جھولیں
کبھی پھول پھول مہکیں
یونہی بیٹھے بیٹھے ورنہ
کہیں ہاتھ کھو نہ جائیں
کہیں پاؤں سو نہ جائیں

کچھ اِدھر اُدھر بھی دیکھو
کوئی نیک و بد ہی سوچو
کہیں آنکھ جم نہ جائے
کہیں ذہن سو نہ جائے

روباہِ خیال

رات کی ساعتوں کے جنگل میں
سادہ کاغذ سے کھیلتی انگلی
ایک تنہا گھڑی کے سوا
ایک مبہم سکوت ہے لیکن
کوئی شے ہے جو زندہ لگتی ہے

میری کھڑکی میں کوئی تارہ نہیں
کوئی شے ہے مگر قریب ترین
جو اندھیرے کے گھپ سمندر میں
گہری تنہائی میں اُترتی ہے
برف جیسے سیاہ نتھنوں سے
کونپلوں پتیوں کو چھوتی ہوئی

ایک روباہ جس کی دو آنکھیں
پھیلتی سبز سبز گہرائی
ہوشیار اور ستارہ سی آنکھیں

اِس طرف اُس طرف بھٹکتی ہوئیں
پیڑ پودوں، تنوں سے بچتا ہوا
اک بدن ایک کھوکھلا سایہ
ہوشیاری سے پاؤں رکھتا ہوا
برف پر نقشِ پا بناتا ہوا
گرم نتھنوں کی بھاپ کی بدبو

کھڑکیاں اب بھی بے ستارہ ہیں
اور گھڑی بھی اُسی طرح تنہا
ہاں مگر میرے سادہ کاغذ پر
حرف ہی حرف لکھ گیا کوئی

(برطانیہ کے ملک الشعرا ٹیڈ ہیوز کی ایک نظم کا ترجمہ)

maablib.org

بہتے پانی کی آواز

پہلی اشاعت : جون ۲۰۰۴ء

maablib.org

خلق اک عرصۂ معلوم سے پیاسی ہے تو پھر
بہتے پانی کی یہ آواز کہاں سے آئی

maablib.org

اکبر حیدرآبادی کے نام

maablib.org

ترتیب

maablib.org

ہم مجبور کسانوں کو مالک آسانی دے
نہروں سے چھٹکارا ہو، نعمت بارانی دے

ہم نے منزل منزل بوئے نئے، انوکھے بیج
اب یہ کام مسافر کا ان سب کو پانی دے

دل میں بہتی نہریں اک اک کر کے بند ہوئیں
کوئی ستم گر بھیج، کوئی نشتر امکانی دے

کب تک چاند کا سایہ اس کو گہن لگائے گا
میری زمیں کو بھی سورج جیسی تابانی دے

مالک میرے شہر میں بسنے والی اک مخلوق
صورت تو انسان کی ہے، عادت انسانی دے

جو اہلِ شہر کے ایمان کا سبب ہوں گے
وہ معجزے مرے پروردگار کب ہوں گے

چھلکتے جام کو دیکھوں تو دل یہ سوچتا ہے
جو سیر ہوں گے وہ کیا خوش نصیب لب ہوں گے

کسے خبر تھی کہ سورج کے گھر کے چشم وچراغ
سفیرِ شام بنیں گے نقیبِ شب ہوں گے

اسی طرح سے جو ٹھہرا رہا غبار تو پھر
جو حادثے نہ ابھی تک ہوئے تھے اب ہوں گے

شکستِ شہرِ تمنا، سقوطِ وادیٔ لب
یہ ظلم پہلے ہوئے تھے نہ ہم سے اب ہوں گے

تم ایسے گلشنِ ناآشنا میں ہو باقرؔ
کہ جس میں گل بھی کھلیں گے تو کم نسب ہوں گے

ستم کے سارے ہنر ہم پہ آزمائے گئے
کنارِ آب سے خیمے تلک ہٹائے گئے

قصوروار کوئی ہو، گناہگار کوئی
فصیلِ ظلم سے ہر بار ہم گرائے گئے

کیے گئے تھے جو سب آبِ زہر سے سیراب
ہماری مشک پہ وہ تیر آزمائے گئے

تمام عمر تھے تیر و سناں کے نرغے میں
ترے تو خوب علم تعزیے اٹھائے گئے

ستم کہ اب انھیں پہچاننے سے منکر ہیں
وہ جن کے واسطے نیزوں پہ سر سجائے گئے

سوادِ شامِ غریباں سے صبح تا پُرساں
اسیر ہم ہوئے اور در بدر پھرائے گئے

نہ کوئی تخت رہا اور نہ فیصلہ باقی
فرازِ تخت سے جب فیصلے سنائے گئے

maablib.org

اگر ٹھہری نہ بارش آسمانی
بہا لے جائے گا منہ زور پانی

ستارے کیوں زمیں پر آ رہے ہیں
فلک پر کیا پڑی ہے ناگہانی

سمندر کے پڑوسی ہم، تھے لیکن
ہماری بات لہروں نے نہ مانی

ہوا کو کیا خبر پانی سے پوچھو
سنو بادل سے بجلی کی کہانی

اُجالے کا کوئی حل اور سوچو
ہوئی ہے روشنی کتنی پرانی

نہ جانے کب سے فکرِ رزق میں ہوں
کہاں کا بچپنا کیسی جوانی

باتیں کم اور شور بہت ہے کس کا حال سنائے کون
موسمِ گل ترے حسن کے نغمے لکھے کون اور گائے کون

تیز ہوا میں اڑنے کا تو ہر طائر کا جی چاہے
تیری ہوا میں چنگاری ہے اس میں پر پھیلائے کون

وادی، جنگل، بستی، صحرا، جینے کے سو رستے ہیں
موت کا نام سمندر ہے اب دریا کو سمجھائے کون

جس کی ہوا میں زہر گھلا ہو جس کا پانی بکتا ہو
اس مٹی کو چومے کون، اِس بستی کو اپنائے کون

روحِ تبسم ریشم میں گم ہے حُسن ہے گہرے پردوں میں
خوشبو جیسی باتیں کرکے باقرؔ کو بہلائے کون

کام آتا ہے آنکھ میں کچھ حیرانی رکھ لینا
جیسے حُسن میں تھوڑی سی نادانی رکھ لینا

کیا معلوم سفر میں کوئی مُحر پیاسا مل جائے
مشکیزے میں ذرا زیادہ پانی رکھ لینا

موسم نے پہنائے ہیں کیسے کیسے پیراہن
لاج بدن کے عیب کی اے عریانی رکھ لینا

دریا بھی بے راہ ہوئے ہیں، نہریں بھی آزاد
میرے لیے تھوڑی سی زمیں بارانی رکھ لینا

فیاضی کا سورج جس دَم ہونے لگے غروب
مٹی کے ذرّوں کے لیے تابانی رکھ لینا

گھر لَوٹے تو گوری کو تحفے میں کیا دو گے
گجرے چھپا کے، اک چُنری دھانی رکھ لینا

سُونا سُونا ہو جاتا ہے پیری کا ملبوس
اس کے لیے تھوڑا سا عطرِ جوانی رکھ لینا

لمبے رستوں میں ملتے ہیں، کبھی کبھی قزّاق
زادِ سفر میں باقرؔ بے سامانی رکھ لینا

mablib.org

کس کی خوشبو اے مشام اور کس کا آنچل اے ہوا
ہم سے سادہ لوح ہوجائیں گے پاگل اے ہوا

روک سکتی ہو تو جشنِ رنگ و بو کو روک لے
ٹہنی ٹہنی ایک دن پھوٹے گی کونپل اے ہوا

غور سے دیکھو تو ایسے مختلف لگتے نہیں
تیری بستی اے ہوا اور تیرا جنگل اے ہوا

جل رہے ہیں دوپہر کی دھوپ میں پیاسے بدن
چھوڑ آئی ہے کہاں تو سارے بادل اے ہوا

پھر نہ کہنا ،کچھ ہمارے مہرباں ایسے بھی ہیں
جو چُرا لیں تیری آنکھوں سے بھی کاجل اے ہوا

رات کے پردے پہ اُبھرے یک بیک کیا کیا نقوش
خامشی میں جب بھی چھنکی تیری پایل اے ہوا

آ کہ سینے میں سما جا، آ رگ و پے میں اُتر
اس کے گیسو، اس کی خوشبو سے مسلسل اے ہوا

سو رہا ہے تھک کے باقرؔ اپنے غم کی ناؤ میں
مت مچا ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل اے ہوا

maablib.org

حادثے اس بحر کے ساحل پہ کم ہوتے نہیں
چھوٹے چھوٹے واقعے کتنے رقم ہوتے نہیں

نام کی خوشبو لگا کر بن نہیں سکتے شہید
سرفروشوں کے تو پھولوں کے علم ہوتے نہیں

روپ مایا کی ہوس نے ایسا دھارا ہے کہ بس
بت کدوں میں بھی تو پہلے سے صنم ہوتے نہیں

کب تلک یوں ہی بہائیں گے پسینے پر لہو
کیا تمھارے جاں نثاروں کے شکم ہوتے نہیں

شکر کیجے آپ کے کچھ چاہنے والے تو ہیں
ساری شمعوں کو تو پروانے بہم ہوتے نہیں

ہم تو اُس کے ہیں جو جیتا جاں کی بازی ہار کر
ٹوٹ سکتے ہیں مگر ہم لوگ خم ہوتے نہیں

نہ شریعت نہ کسی زندہ نشاں سے آئی
خصلتِ ننگ کسی نسلِ بتاں سے آئی

درپئے قتل ہیں ہر ایک کے اس شہر کے لوگ
تجھ میں یہ خوشبوئے دم ساز کہاں سے آئی

لب ہوئے بخیہ، گلے کٹتے رہے ہیں پھر بھی
وہی خوشبو ہے جو ہر تازہ بیاں سے آئی

خلق اک عرصۂ معلوم سے پیاسی ہے تو پھر
بہتے پانی کی یہ آواز کہاں سے آئی

دیکھیں کس حال میں ہے باقرِ شرمندہ مزاج
اس میں یہ چشمِ نگہ باز کہاں سے آئی

ہمیشہ اک نئی رت سے نبھانا پڑ رہا ہے
عجب رنگوں سے اپنا گھر سجانا پڑ رہا ہے

مبارک ہو ہمارے مہرباں چارہ گروں کو
دوا کے طور پر اب زہر کھانا پڑ رہا ہے

جہاں کی خاک میں خوشبو بسی ہے بچپنے کی
وہ گلیاں چھوڑ کر پردیس جانا پڑ رہا ہے

ہوائیں خود دھماکا خیز اتنی ہیں کہ اب تو
ہواؤں کو چراغوں سے بچانا پڑ رہا ہے

ستم کیا ہے کہ جس پر خوں کے آنسو رو رہے تھے
وہ سارا ماجرا گا کر سنانا پڑ رہا ہے

مری شاخوں سے اب چنگاریاں گرنے لگی ہیں
تو ہم کو سبز پیڑوں کو جلانا پڑ رہا ہے

مرے نزدیک یہ توہین ہے ان بازوؤں کی
جنھیں تکذیب کا پرچم اٹھانا پڑ رہا ہے

انوکھی خواہشوں کے رنگ سے منظر بنے تھے
انھیں خود اپنے ہاتھوں سے مٹانا پڑ رہا ہے

maablib.org

لمبی ہوئی برسات تو دریا بڑھتا جائے گا
دریا بڑھتا جائے تو خطرہ بڑھتا جائے گا

تم نے کسی کی راہ میں اتنے کانٹے کیوں بوئے
کیا ہوگا انجام جو پودا بڑھتا جائے گا

ایک اکیلا سورج کب تک اپنی جان جلائے
کوئی کرو تدبیر، اندھیرا بڑھتا جائے گا

ایک قدم رکھا تو باہر نکل نہ پاؤ گے
تنگ نہیں ہوگا یہ گھیرا بڑھتا جائے گا

اک جگنو سے رات نہیں روشن ہوتی پھر بھی
کر دیکھو اعلان اجالا بڑھتا جائے گا

شرر کے پھول فضا میں اڑائے گا کوئی دن
ڈرائے گا وہ کسی دن، لبھائے گا کوئی دن

ابھی تو صرف ملایا ہے جوئے آب میں رنگ
لہو کا رنگ بدل کر دکھائے گا کوئی دن

تم اپنے تاج محل کی سلامتی میں مگن
ہمیں یہ خوف وہ کعبے کو ڈھائے گا کوئی دن

طویل رات تو آخر کو جائے گی کسی روز
ہماری شیشے کی چھت پر بھی آئے گا کوئی دن

بہت پسند ہے یاری غلط ہواؤں سے
یہ بادباں ہمیں الٹا بہائے گا کوئی دن

سنا ہے خانۂ خالی میں دیو بستے ہیں
سو میرے دل کو بھی کوئی بسائے گا کوئی دن

دلوں کے بیچ محبت ہے سلسلہ تو نہیں
یہ سلسلہ ہے تو پھر ٹوٹ جائے گا کوئی دن

ہمیں یقین ہے باقرؔ وہ دن بھی آئے گا
ہنسے گی رات کوئی مسکرائے گا کوئی دن

maablib.org

موسم نے عجب حال بنایا مرے گھر کا
بجلی کی عنایت ہے اجالا مرے گھر کا

باہر سے نظر آتے ہیں اندر کے مناظر
یہ پردۂ سیمیں ہے کہ پردا مرے گھر کا

سب رنگ چلے جاتے ہیں ہمراہ خزاں کے
بس میرا وفادار ہے سبزا مرے گھر کا

ہر چار پہر رہتا ہوں دشمن کی نظر میں
کیا مفت میں ہو جاتا ہے پہرا مرے گھر کا

میرے در و دیوار کے دشمن ہیں وہی لوگ
کام آتا ہے جن لوگوں کے سایا مرے گھر کا

کیا خوب محبت کا ہے انداز، مرے دوست
تختے میں اٹھا لے گئے تالا مرے گھر کا

باقرؔ وہی جھونکا ہے مجھے جان سے پیارا
جو آ کے بدل دیتا ہے نقشا مرے گھر کا

شہر میں یوں تو ڈھیر بہت ہے سونے چاندی کا
لطف تو جب ہے محل ہو اپنا چاند کی مٹی کا

دل پتھر کا ہوتا شاید آنکھیں شیشے کی
مجنوں صاحب شکر کرو حوا کی بیٹی کا

چاند کو گرہن سال میں دو اک بار ہی لگتا ہے
ہم نے تو ہر رات ہی دیکھا گرہن دھرتی کا

اس مٹی نے ہمیں بہت مایوس کیا جبریل
اب کوئی پتلا چاند کی یا مریخ کی مٹی کا

مٹی مٹی کرتا ہے اور بھول گیا پیارے
ستر فی صد جسم ترا مقروض ہے پانی کا

دھرتی ہم نے تجھ سے مانگا بھی تو کیا مانگا
ایک پیالہ پانی، ایک نوالہ روٹی کا

دنیا کے ہر کام سے ہم ہو جاتے ہیں بے کام
شام ڈھلے جب کھل جاتا ہے پٹ اک کھڑکی کا

اسلام آباد بسانے والے ملے بہت باقرؔ
ہے کوئی چاہنے والا اپنے شہر کراچی کا

جیسا حضور کہیں گے بالکل ویسا ہوگا
یعنی پھر گڑیوں کا کھیل تماشا ہوگا

محل تو ہولی دیوالی کے لیے بنے ہیں
آگ کا رزق تو لاوارث کا خیمہ ہوگا

کھارے پانی کی جھیلیں سب بچ جائیں گی
لقمہ سیاہ سمندر کا بس دریا ہوگا

میری تیری آنکھ کی قسمت کنکر مٹی
ان کی آنکھ کی زینت ہو تو سرما ہوگا

دوزخ کے سب دروازے تو کھلے ہوئے ہیں
جنت کے دروازے پہ کیا تالا ہوگا

ساحل پہ جب سبز فرشتے ہی رہتے ہیں
دریا میں پھر کس نے زہر ملایا ہوگا

میرا سلام اُس شہزادے کو پہنچا، جس کے
بے سر جسم پہ اِک بوسیدہ کُرتا ہوگا

بتاؤں کیسے کہ میں نے ہی خود پہ وار کیا
وہ خوش بہت ہے کہ اس نے مجھے شکار کیا

اسی کی چاہ کے تمغے سجائے پھرتے ہیں
عدو میں جس نے ہمیشہ ہمیں شمار کیا

ہم ایک شاخ پہ اک پھول دیکھ کر مسرور
اسے یہ دکھ کہ اسے موسموں نے خوار کیا

عجب، کہ تُو بھی ہمارے سفر سے عاجز ہے
ترے لیے ہی سفر ہم نے بار بار کیا

قدم قدم پہ لگائی تھی باڑھ کانٹوں کی
پھر اس نے خوب دواؤں کا، کاروبار کیا

اگر کسی کو ہنسانا بھی جرم ہے تو جناب
یہ جرم ہم نے کیا اور بے شمار کیا

قدم قدم پہ تھے سدّ سکندری باقرؔ
نہ پوچھ کیسے سمندر کو ہم نے پار کیا

maablib.org

ان بولتی آنکھوں سے اس دن کچھ تم نے کہا تھا چپکے سے
پھر خشک ببول کی ٹہنی پر اک پھول کھلا تھا چپکے سے

وہ کیسی انوکھی بارش تھی وہ کیسا رسیلا موسم تھا
جب تم چھلکے تھے چپکے سے اور میں مہکا تھا چپکے سے

بجتی ہے بہت تسبیح و عبا اُس شام مگر اُس جام میں کیا
ساقی نے دیا تھا چپکے سے اور کس نے پیا تھا چپکے سے

کچھ پیاس بھی تھی کچھ حبس بھی تھا کچھ صحرا مائلِ رقص بھی تھا
تب دو بادل ٹکرائے تھے اور رس ٹپکا تھا چپکے سے

شرمندہ شام کی لالی ہوئی ،اُس رات عجب دیوالی ہوئی
جب سونی سونی آنکھوں میں اک دیپ جلا تھا چپکے سے

رنگ آنکھوں میں لہرائے بہت باقرؔ وہ ہمیں یاد آئے بہت
جب دن ڈوبا تھا ہولے سے جب چاند اُبھرا تھا چپکے سے

کہتے ہیں اس باغ کا نعم البدل کوئی نہیں
پھول تو لاکھوں ہیں لیکن اس میں پھل کوئی نہیں

سنگ دل شہروں کو ہجرت کر گئے اور گاؤں میں
کھیتیاں بنجر پڑی رہتی ہیں، ہل کوئی نہیں

واہ کیا مشکل سفر تھا، کیسی مشکل منزلیں
گرد چہروں پر نہیں اور پاؤں شل کوئی نہیں

جس میں گرہیں، جس میں خم تھے وہ بھی ہے دار پر
ہم نے وہ رسّی جلادی جس میں بل کوئی نہیں

کیسے خود مختار سورج ہو تمہارے اردگرد
مشتری، مریخ، زہرہ اور زحل کوئی نہیں

ہم کو اُن سے بھی بڑے بت پوجنے والے ملے
تم تو کہتے تھے کہ اب لات و ہبل کوئی نہیں

آج تک یارو گزاری تم نے کیسی زندگی
ڈائری میں آج ہے بس، جیسے کل کوئی نہیں

ہم نے شہ کی بات مانی اور نہ اس کے گھر گئے
آج شاید ہم سے بڑھ کر بے عمل کوئی نہیں

شہرِ گریہ میں گزرتی ہو تو شاعر کیا کرے
لکھ رہے ہیں سب غزل لیکن غزل کوئی نہیں

ہو اگر باقرؔ توسّل تیرا اہلِ ذکر سے
کون سی مشکل ہے ایسی جس کا حل کوئی نہیں

نئی بستی ہے، گھر محفوظ کروالو تو اچھا ہے
مقابل در کے اک دیوار اٹھوالو تو اچھا ہے

تمہارے باغ کے سب پیڑ اتنے گل فشاں کیوں ہیں
نئے موسم سے ان کی فصد کھلوالو تو اچھا ہے

بہت ہی سادہ دامانی ریاکاری سی لگتی ہے
کہیں سے چھوٹے موٹے نقش بنوالو تو اچھا ہے

ہمیں ہے عالمِ مستی میں عادت گل فشانی کی
یہ خفیہ خط کسی گونگے سے پڑھوالو تو اچھا ہے

تمھاری ہر ادا کافر ہے پھر بھی آپ کی خاطر
کبھی تھوڑا سا گنگا جل چھڑکوا لو تو اچھا ہے

ہماری پیش بینی پر تمھیں کب اعتبار آیا
سو اب کے فال طوطے سے نکلوا لو تو اچھا ہے

تمھاری تو پرانی دوستی ہے سود خواروں سے
انھیں سے یہ گنہ کی فصل کٹوا لو تو اچھا ہے

وفاداری کا یہ تمغا جو ہے سینے پہ آویزاں
نئے اعمال سے پھر اس کو چمکا لو تو اچھا ہے

نہ جانے کون کب آجائے اور دھوکے سے بس جائے
قبالہ ارضِ دل کا جلد لکھوا لو تو اچھا ہے

تمھارے ہاتھ کی انگشتری تو خوب ہے لیکن
نگینے پر کسی کا نام کھدوا لو تو اچھا ہے

تمھاری دوستی کب دوستوں کے کام آتی ہے
کتابِ دوستاں سے نام مٹوالو تو اچھا ہے

مبادا لب کشائی سے مری، آتش فشاں نکلے
جو فرمانا ہے تم پہلے ہی فرمالو تو اچھا ہے

نہ جانے کب سے جپتا ہے تمھارے نام کی مالا
سوئمبر میں کبھی باقرؔ کو بلوالو تو اچھا ہے

اس قدر تند ہوئی گرمیِ بازار کہ بس
بولیاں ایسی لگاتے تھے خریدار کہ بس

لوگ سمجھے تھے کہ یہ صبر چلے گا کچھ دن
اتنی نازک تھی مگر بیچ کی دیوار کہ بس

ہاں ارادہ تو یہی تھا کہ گئے اور آئے
پاؤں مٹی میں ہوئے ایسے گرفتار کہ بس

ہم شناور تھے کہاں تیز رواں پانی کے
ایسا منظر تھا مگر نہر کے اس پار کہ بس

خام کلیوں نے چٹک کر مرا دل موہ لیا
مہرباں ایسا ہوا سبزۂ بیدار کہ بس

کیا ستم ہے کہ ملا ہجر کی بستی میں سکوں
اس کی قربت تھی کچھ ایسی ہی دل آزار کہ بس

بچ کے ہر بار نکل جاتے تھے لیکن اب کے
ایسے ہاتھوں میں ہے انصاف کی تلوار کہ بس

دل کی تقسیم کے قائل ہی نہیں ہم ورنہ
تھا وہ طاؤس کچھ ایسا ہی طرح دار کہ بس

maablib.org

آگ بجھنے لگی دھواں تو ہوا
کچھ نہیں تو وہ مہرباں تو ہوا

جس طرف چاہے اب ہمیں لے جائے
راہزن سے وہ سارباں تو ہوا

کچھ برستا نہیں پہ ابر تو ہے
دھوپ میں کوئی سائباں تو ہوا

لب ہلائے تو، خواہ کچھ بھی کہا
بے زبانی سے کچھ عیاں تو ہوا

maablib.org

کوئی ہوا زدہ چراغ زینتِ بام ہے تو ہو
پھر کوئی نامراد رات گرِ پسِ شام ہے تو ہو

آنچ بہت لگی مگر کوئی اثر نہیں ہوا
زد میں شکست کی اگر وہ بتِ خام ہے تو ہو

میرے لہو کی نہر میں نفت ملا دیا گیا
دل کے شرر کے واسطے اب کوئی کام ہے تو ہو

ہم نہ ہوا پرست ہیں اور نہ لہر کے شریک
اس زیرِ خاک کا اگر کوئی غلام ہے تو ہو

بے ہنری کے باب میں ہم بھی کسی سے کم نہیں
کسبِ ہنر میں آپ کا کوئی مقام ہے تو ہو

توڑ کے ساری بندشیں ہم نے لگائی ہے زقند
وسعتِ آسماں میں بھی گر کوئی دام ہے تو ہو

گردشِ صبح و شام کی ساری ہیں مہربانیاں
میرا قصور کیا اگر رقص حرام ہے تو ہو

آپ سے دوستی رہی اتنے دنوں تو کیا ہوا
اب مرے دشمنوں میں بھی آپ کا نام ہے تو ہو

maablib.org

اُنھیں سے بام سجیں گے وہی سقف ہوں گے
جو سارے قریے کے اشراف کے شغف ہوں گے

نہیں ہے کل کا کوئی خوف سنگریزوں کو
اُنھیں ہو فکر جو پروردۂ صدف ہوں گے

نہ اس قدر قدِ بالا پہ اپنے ناز کرو
بلند ہوں جو زیادہ وہی ہدف ہوں گے

وہ دن بھی آئے کہ جب لڑکیوں کے ہاتھوں میں
حنا کے رنگ سجے ہوں گے اور دف ہوں گے

وہ یومِ صدق جب آئے گا، اپنے ہاتھوں میں
ہمارے اپنے ہی اعمال کے حلف ہوں گے

علی ؑ کے عشق میں ہم کو یقین ہے باقرؔ
ہماری خاک کے ذرے دُرِ نجف ہوں گے

شہد کی نہریں مت کھدواؤ دودھ کا دریا رہنے دو
پیاسے ہی اچھے لگتے ہیں ہم کو پیاسا رہنے دو

ہم موسم کے پھول ہماری بات ہی کیا اوقات ہی کیا
وہ جو فخرِ صنوبر ہے بس اس کو اونچا رہنے دو

خواب میں کیا کچھ دیکھا تھا اور اس کی کیا نکلی تعبیر
یارو سب کچھ تو مت پوچھو کچھ تو پردا رہنے دو

بنیادوں کے زخم لگیں گے پھیلیں گے رستوں کے جال
وادیِ دل پر رحم کرو اسے اونچا نیچا رہنے دو

سعیِ صفا کوئی دوڑ نہیں ہے، طوفِ حرم تفریح نہیں
سجدے کو رسوا نہ کرو سجدے کو سجدا رہنے دو

رات

ہر ایک کھڑا ہے دھرتی پر
دھرتی کی دھڑکتی چھاتی پر
کرنوں کے بھالوں میں پیوستہ
اور اچانک رات ہوئی

(کاسی موڈو کا ترجمہ)

maablib.org

ناریل

یہ جو دو ناریل تم نے
مجھے تحفے میں بھیجے ہیں
بہت ہی خوش نما ہیں
دیکھنے میں سبز لگتے ہیں
مگر تم کو نہیں معلوم شاید
ناریل جب پکنے لگتے ہیں
تو ان میں رس نہیں رہتا

maablib.org

کون یہ کنجِ خیالات میں آئے ہوئے ہیں
سارے موسم مری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں

اب کوئی عطر بھی اچھا نہیں لگتا ہم کو
ہم کسی جسم کی خوشبو میں نہائے ہوئے ہیں

سلطنت ہے، نہ رعایا، نہ کوئی مال و متاع
بوجھ کیوں تاج کا پھر سر پہ اٹھائے ہوئے ہیں

آج وہ جن کو پہنتے ہوئے اتراتا ہے
سارے موتی یہ ہمارے ہی گنوائے ہوئے ہیں

ہم پہ کیا لطف کرے گی شبِ نادار کہ ہم
اپنے ہر انگ میں اک شمع جلائے ہوئے ہیں

روئے نوروز خجل، آنکھ چراتی ہے بسنت
ہم وہ بدرنگ، فضاؤں میں اُڑائے ہوئے ہیں

آگ کے دوست نہ بن جائیں کسی روز یہ سب
تیز بہتے ہوئے پانی کے ڈرائے ہوئے ہیں

اس کو معصوم سمجھنا بڑی نادانی ہے
زخم تمغوں کی طرح جس نے سجائے ہوئے ہیں

موسم اب شہر میں آتے ہوئے شرماتے ہیں
اپنے کوچوں میں وہ گل آپ کھلائے ہوئے ہیں

یہ محبت کا اثر ہے کہ کسی خوف سے ہم
ہر طرف ایک ہی تصویر لگائے ہوئے ہیں

اس میں کچھ راز نہیں، اس لیے خوش حال ہیں ہم
سارے منحوس ستاروں کے بھلائے ہوئے ہیں

نرم جھونکوں کے تماشے میں نہ آنا باقرؔ
یہ بلا خیز ہواؤں کے سکھائے ہوئے ہیں

maablib.org

ظاہر جو ہوتا ہے وہ احوال نہیں ہوتا
ہر سر سبز درخت سدا خوش حال نہیں ہوتا

ہر چالاک شکاری کا ہوتا ہے اپنا رنگ
سب کے ہاتھوں میں اک جیسا جال نہیں ہوتا

جس نے خود میں رنگ بھرا وہ سدا رہا آباد
گل بوٹے والا سبزہ پامال نہیں ہوتا

ہاتھ ہلاؤ، پاؤں چلاؤ، لوگوں کے کام آؤ
مر جاتا ہے انگ جو استعمال نہیں ہوتا

دریا رخ موڑے تو خود دریا ہے گھاٹے میں
کسی سمندر میں پانی کا کال نہیں ہوتا

کہاں ہے ایسا ملک، ایسی تہذیب، ایسا مذہب
جس میں کسی بھی شخص کا استحصال نہیں ہوتا

کیا کھیل ہے، ماتھا بھی وہی، در بھی وہی تھا
اندر بھی وہی شخص ہے، باہر بھی وہی تھا

مے خوار بہت خوش تھے کہ ساقی ہے کوئی اور
افسوس کہ مے بھی وہی، ساغر بھی وہی تھا

یوں ہی تو نہیں بنتے ہیں صحرا و بیاباں
قطرہ بھی وہ، دریا بھی، سمندر بھی وہی تھا

بتلاؤ تو پھر کس کے طرف دار تھے ہاتھی
پورس بھی وہی شخص سکندر بھی وہی تھا

امّید بہت جس سے رکھی بت شکنی کی
افسوس کہ بت بھی وہی آزر بھی وہی تھا

کیا شام کیسی رات کی دیوار دیکھنا
آنکھو! نئے ہلال کے آثار دیکھنا

مانے نہیں بناتے رہے ٹیڑھے دائرے
پہنچا کہاں ہے نقطۂ پرکار دیکھنا

دیکھیں جو آنکھ بھر کے تو گل سے دھواں اُٹھے
ناشاد بلبلوں کے چمکار دیکھنا

سر پر گلاب، جسم پہ گل دار کفنیاں
نکلے ہیں سج کے کیسے عزادار دیکھنا

کچھ کہہ رہی ہے خلق تو کہتے ہیں کچھ مشیر
فرصت ملے تو شہر کی دیوار دیکھنا

طوفِ حرم سے لوٹ تو آئے یہ خاکسار
پھر دیکھنا صنم، مری سرکار دیکھنا

حیران ہو رہا ہوں کہ کس کی ثنا کروں
شہ سے بڑھے ہیں شہ کے طرف دار دیکھنا

اس ملک میں جہاں کی رعایا فقیر ہو
ہر سو جواہرات کے انبار دیکھنا

بے ربط سی عبارتیں اور سر کٹے حروف
ٹوٹے ہوئے قلم کے قلم کار دیکھنا

ہم رائگانِ موجۂ دریا کا شغل کیا
اِس پار دیکھنا کبھی اُس پار دیکھنا

اِک لکھنوی زبان کی صہبا فشانیاں
گویا پچاس سال کے افکار دیکھنا

لندن کی اوس جھیل کے آئے ہیں بیس سال
باقرؔ میاں کی گرمیِ گفتار دیکھنا

maablib.org

یوں لگا قدم بچ بچ، اس گلی میں پہلی بار
جیسے چل رہے ہوں ہم، زندگی میں پہلی بار

حرف حرف تابندہ، رنگ رنگ تھا پھر بھی
ہم نہ پڑھ سکے کچھ بھی، روشنی میں پہلی بار

اب تو بس یہ خواہش ہے نیند ہی رہے طاری
ایسا خواب دیکھا ہے، آگہی میں پہلی بار

ہوش کے بدن کے سب تار جھنجھنا اٹھے
نغمہ وہ سنا دل نے بے بسی میں پہلی بار

عمر بھر کے دشمن سے دوستی ہوئی کیسے
بس گنوا دیا سب کچھ دوستی میں پہلی بار

آج تو بہکنے دو میرے یار باقر کو
ہم نے اس کو دیکھا ہے بے خودی میں پہلی بار

دل میں اتر گئیں تری رعنائیاں تمام
پھر یوں ہوا کہ بج اٹھیں شہنائیاں تمام

کس نے مری خلا کو ستاروں سے بھر دیا
کیا رنگ رنگ ہو گئیں پہنائیاں تمام

اے جانِ بزم آ کے مرا گھر تو دیکھ لے
کیا کیا سجا کے رکھی ہیں تنہائیاں تمام

بس کچھ اِسی طرح مری تصویر بن گئی
کاغذ پہ جمع ہو گئیں پرچھائیاں تمام

باقرؔ یہ کیا کہ شہر میں جلوے اسی کے ہیں
وہ شخص جس پہ ہو گئیں رسوائیاں تمام

دشمن بھی عقل مند ہیں جاہل نہیں رہے
اب اہلِ سیف کے وہ مشاغل نہیں رہے

شکوہ ہے ساحلوں کو، کہ دریا ہوئے ہیں خشک
دریاؤں کو گلہ ہے کہ ساحل نہیں رہے

اس شہر میں وہ شہر کی باتیں نہیں رہیں
یا ہم تمھارے شہر کے قابل نہیں رہے

کچلی گئی ہیں کیاریاں، روندے گئے ہیں باغ
جب راستے ہجوم کو حاصل نہیں رہے

maablib.org

چشمِ تاجر کی ضرورت ہو نہ بازار چنے
جنس وہ ہے کہ جو خود اپنا خریدار چنے

اپنا احوال بھی کچھ کوفہ و بغداد سا ہے
کیسی ساعت میں گئے شہر کے آثار چنے

کوئی کیوں وجہِ ملامت ہو کہ ہم نے خود ہی
گل، گہر چھوڑ دیے، سنگ چنے، خار چنے

کھیل یہ اپنے عمل کا ہے مقدر کا نہیں
کوئی سولی پہ چڑھے اور کوئی دربار چنے

اب نہ آ پائے گا وہ دَور کہ باقرؔ جس میں
خونِ سیّد سے کوئی شہر کی دیوار چنے

اپنے تلووں پر لہو ملتے رہو، رکنا نہیں
رک گئے تو موت ہے چلتے رہو، رکنا نہیں

پیڑ دشمن آندھیاں جب آئیں گی، تب آئیں گی
ناتواں پیڑو مگر پھلتے رہو، رکنا نہیں

ظلمتیں جلدی بجھانے کے لیے بھڑکائیں گی
ہاں چراغو، صبح تک جلتے رہو، رکنا نہیں

ہاں کبھی تو جوہروں کی قدر کے دن آئیں گے
موتیوں کے روپ میں ڈھلتے رہو، رکنا نہیں

خاک میں کوئی ملائے پھر بھی اس کا شکریہ
بیج بن کر خاک میں پلتے رہو، رکنا نہیں

فضا گھر کی بہت تھی، گھر سے باہر تم نے کیوں دیکھا
تم اک چشمے کے لائق تھے، سمندر تم نے کیوں دیکھا

تمھیں معلوم تھا یہ شہر ہے کتنا طلسماتی
تم آخر ہوگئے پتھر، پلٹ کر تم نے کیوں دیکھا

برہنہ تھا اگر کوئی تو اپنے گھر کی خلوت میں
جھروکے سے کسی کے گھر کے اندر تم نے کیوں دیکھا

زیادہ روشنی کم روشنی کو چاٹ لیتی ہے
برہنہ آنکھ سے گرہن کا منظر تم نے کیوں دیکھا

بہت نادار تھے لیکن ہزاروں سے تو اچھے تھے
تو پھر آشوبِ دارا و سکندر تم نے کیوں دیکھا

بہت سے منظروں سے جان کر منھ پھیرنا اچھا
کوئی دیکھے تو دیکھے جائے، باقرؔ تم نے کیوں دیکھا

چشمۂ شب

عورت

اک چشمۂ شب کی مانند
جس کی خاموش روانی کا گرفتار ہوں میں

(اکتاویو پاز کا ترجمہ)

maablib.org

گلشن نہیں یہ شہر ہے، نقلِ صبا نہ کر
خوشبو کی طرح راہ میں سب سے ملا نہ کر

دیکھے کہاں ہیں تو نے ابھی شب کے سارے رنگ
اک چاند کی چمک پہ کوئی فیصلہ نہ کر

آخر ہمارے بیچ ہیں کچھ دکھ بھی مشترک
اندازِ دشمنی میں ہمیشہ ملا نہ کر

ہوگی طویل عمر تو ہوں گے زیادہ دکھ
میرے لیے تو عمرِ خضر کی دعا نہ کر

آپ بیتی کو نئے درد میں گانے لگتا
پھر کوئی تیر اگر دل کے نشانے لگتا

تاکہ میں اپنے خیالات سے آگے نہ بڑھوں
وہ مجھے میرے ہی اشعار سنانے لگتا

پیرہن میرا ہو اور خون کے آنسو اس کے
اس کا سر آ کے ہمیشہ مرے شانے لگتا

اتنا بے داغ تھا کچھ اپنے چمن کا دامن
کوئی موسم بھی ہو بس رنگ جمانے لگتا

کیا بھرے شہر میں تھا بس مرا شانہ خالی
میں کسی اور کا کیوں بار اٹھانے لگتا

یہ غنیمت ہوا مانی نہ کوئی بات اس کی
ورنہ اس روز فقط میں ہی ٹھکانے لگتا

کھولنا چاہتا لب جب بھی کسی محفل میں
کوئی چپکے سے مرا ہاتھ دبانے لگتا

بام پر تھا کوئی اس وقت تو مجبوری تھی
کیا میں خواہش کی پتنگ اپنی اڑانے لگتا

maablib.org

ہوا کو آزمانا چاہیے تھا
نئی شمعیں جلانا چاہیے تھا

برادر، اپنے آنگن سے پرے بھی
کوئی پودا لگانا چاہیے تھا

زیادہ ہی فضا کچھ صاف تھی تو
ہوا میں رنگ اڑانا چاہیے تھا

نیا غازہ نئی خوشبو پہن کر
نئی محفل میں جانا چاہیے تھا

سفر درپیش ہے مقتل کا ہم کو
بس اک کُرتا پرانا چاہیے تھا

یہ ساحل کیا جہاں ذلّت ہی ذلّت
بھنور میں ڈوب جانا چاہیے تھا

شکایت کیا قفس کی، بال و پر کی
تمھیں تو آب و دانہ چاہیے تھا

ان آوارہ اندھیروں کے بہانے
نئی مشعل جلانا چاہیے تھا

تمھارے حال پر روتا زمانہ
تمھیں تو مسکرانا چاہیے تھا

maablib.org

کوئی خوشبو، کوئی آنچل، کبھی سوچا تم نے
کیوں چھنک اٹھتی ہے پایل، کبھی سوچا تم نے

بے ضرورت سے زیادہ ہوں آپ تمھیں
کیسے بن جاتے ہیں دلدل، کبھی سوچا تم نے

وقت ملتا ہے تو جنگل کی طرف بھاگتے ہو
کیوں بھلے لگتے ہیں، جنگل کبھی سوچا تم نے

کیا زمینوں نے کیا شہر کے سبزے سے سلوک
کیوں برستے نہیں بادل، کبھی سوچا تم نے

خوب ہے ناقہ و محمل کی سہولت لیکن
لوگ کیوں چلتے ہیں پیدل، کبھی سوچا تم نے

میری نس نس میں بسی کیوں ہے تمھاری خوشبو
میرے عنبر، مرے صندل، کبھی سوچا تم نے

سب کو آسانی سے کہہ دیتے ہو پاگل باقرؔ
تم بھی ہو سکتے ہو پاگل، کبھی سوچا تم نے

maablib.org

کیا عشق کیا، کیا حال ہوا، تائیدِ صنم کرتے کرتے
ہم اپنا چراغ بجھا بیٹھے خود ہی لَو کم کرتے کرتے

ہیں مشفق خلق نواز بہت، ذرا ان پہ نگاہ کڑی رکھنا
کہیں قابض لب پہ نہ ہو جائیں تمھیں رزق بہم کرتے کرتے

کبھی جا کر اس سے پوچھا بھی، راضی تجھ سے ہے بھی کہ نہیں
سینہ تیرا پتھر کا ہوا جس کا ماتم کرتے کرتے

جب پانی سے پانی کا ملن ہونا ہے تو ہو بھی، ورنہ کہیں
گنگا جمنا بے راہ نہ ہوں سنگم کرتے کرتے

ہم بھی تو انوکھی خلقت ہیں، اک کاٹو تو دو اُگتے ہیں
اک دن وہ بھی تھک جائے گا یہ ہاتھ قلم کرتے کرتے

ایمان اسی منزل پہ رہا، اُتنی ہی عقل، اطوار وہی
گھٹنوں تک لیکن پاؤں گھسے ہیں طوفِ حرم کرتے کرتے

کہتے ہیں کہ میرے آنگن کی ہر بوٹی ہے تریاق مگر
ہو جاتے ہیں زخمی ہاتھ بہت ان کو مرہم کرتے کرتے

سب تیرے ڈھب پہ چلے باقرؔ تو یہ دنیا کیا دنیا ہوگی
تو خوشیاں کرنا بھول گیا ہر بات پہ غم کرتے کرتے

maablib.org

میں خوش امید، بیاباں سنورتے دیکھتا ہوں
سمندروں میں جزیرے ابھرتے دیکھتا ہوں

خبر نہیں یہ کوئی زہر ہے کہ آبِ حیات
جو قطرہ قطرہ رگوں میں اترتے دیکھتا ہوں

کتابِ زیست کے سب حرف پڑھ لیے اس نے
میں اپنے آپ کو اب ڈرتے دیکھتا ہوں

گہن کے وقت کہ جب سارا شہر خوف میں ہو
نئی امید کے تارے ابھرتے دیکھتا ہوں

خدا کرے کہ مرے سارے خواب جھوٹے ہوں
نہ جانے خواب میں کیا کیا بکھرتے دیکھتا ہوں

تمام سوئے ہوئے نقش جاگ اٹھتے ہیں
جب ایک طفل کو کچھ رنگ بھرتے دیکھتا ہوں

جو اپنی بے ہنری میں مثال تھے ان کو
نئے نئے ہنر ایجاد کرتے دیکھتا ہوں

زمیں کے خشک لبوں کی صدائیں سنتا ہوں
اور آسمان سے بادل گزرتے دیکھتا ہوں

خزاں کے پار نئے رنگ بھی ہیں خوشبو بھی
میں اپنے باغ کو اک دن سنورتے دیکھتا ہوں

maablib.org

کوئی سویا زخم پھر تازہ ہوا
رات درد اٹھا تو اندازہ ہوا

ہر طرف دیوار ہی دیوار تھی
آپ در آئے تو دروازہ ہوا

اشک ٹھہرے سرخ آنکھوں کی زکوٰۃ
خون زخمِ دل کا خمیازہ ہوا

بس وہی ذرّہ تو نکلا کام کا
جو کسی رخسار کا غازہ ہوا

رنگ ہے بس رنگ، خوشبو کے بغیر
کھو گئی خوشبو تو اندازہ ہوا

نہ قربت میں نہ دل کے باب میں تھی
جو لذت بوسۂ نایاب میں تھی

بسی کس کے تنِ صندل کی خوشبو
مرے گھر میں، مرے اسباب میں تھی

سمندر کے نمک خواروں میں ہوں اب
ملاوٹ کس طرح کی آب میں تھی

کلاہوں میں سجاتے تھے اگر شاہ
تو کیا عزت پرِ سُرخاب میں تھی

اندھیرا اس کو جب چاہے نگل جائے
یہ کیسی روشنی مہتاب میں تھی

بہت جی خوش ہوا جاگا ہوں جب سے
بشارت جانے کیسی خواب میں تھی

ملتے رہنا آتے رہنا
یوں ہی کرم فرماتے رہنا

مشک بدن اور عنبر گیسو
گلیوں کو مہکاتے رہنا

رنگت تم سے، خوشبو تم سے
آنچل کو لہراتے رہنا

بادل ہو جب چاہو برسو
مٹی کو ترساتے رہنا

ہونٹوں کے ہنستے جادو سے
پتھر دل پگھلاتے رہنا

چیکے چیکے میٹھا میٹھا
کان میں رس ٹپکاتے رہنا

عاشق دل بالک ہوتا ہے
بالک کو بہلاتے رہنا

چاند ہو تم تو چاندنی بن کر
میری چھت پر آتے رہنا

روپ چھپا کر چھب دکھلا کر
باقرؔ کو تڑپاتے رہنا

maablib.org

شہتوت

تمھارے باغ کے شہتوت
کتنے رس بھرے ہوتے ہیں
میٹھے میٹھے ہوتے ہیں
مگر کیا بات ہے
لہجہ تمھارا باغبانوں سے
ہمیشہ تند ہوتا ہے
ہمیشہ تلخ ہوتا ہے

maablib.org

مرے برگزیدہ بدن پہ بھی کسی روز اتنا کرم کرو
کہیں گرم ہونٹوں سے داغ دو، کوئی سرخ شعر رقم کرو

نہیں ختم ہونے کا یہ دھواں، یہ نتیجہ بند فضا کا ہے
کرو ورد سورۂ شمس کا کہ دعائے نور کا دم کرو

وہ جو پھول تم نے لگائے تھے وہ چمن کے جسم کے زخم ہیں
کوئی اور رنگ عیاں کرو، کسی اور بیج کو نم کرو

تمھیں کیا خبر یہ کرن کرن کہیں ہو نہ جائے گہن گہن
ہیں اگرچہ روشنیاں بہت مگر اپنی لَو کو نہ کم کرو

یہ جو نورِ عقلِ سلیم ہے اسے شمعِ راہِ خدا کرو
یہ جو ریسمانِ گناہ ہے اسے زیبِ حلقِ صنم کرو

مرے ذہن کی مرے قلب کی مرے خوں کی جان ہے روشنی
میں بھکاری ایک کرن کا ہوں مجھے سائے میں تو نہ ضم کرو

ہے لچک کی ہم میں سکت مگر ہے لچک کی بھی کوئی انتہا
کسی روز ٹوٹ نہ جائیں ہم ہمیں اتنی بار نہ خم کرو

maablib.org

اجالا پشت پر، انجان سایا سامنے تھا
اور اک ناآشنا بے انت صحرا سامنے تھا

دعا کو ہاتھ اٹھے اور کھیتیاں سوکھی پڑی تھیں
سمندر موجزن اور خشک دریا سامنے تھا

ہوائیں دم بخود تھیں، خوں زدہ پرچم نگوں تھے
قریب شام اور شب رنگ رستا سامنے تھا

کسے معلوم پس منظر میں کیا کیا دکھ نہاں تھے
نظر میں تو بس اک زربفت پردا سامنے تھا

شعور و علم صف باندھے کھڑے تھے دست بستہ
اور اک خوش پوش سا بے علم مُلّا سامنے تھا

ہزاروں بوریاں گندم بھری گودام میں تھیں
غضب یہ ہے کہ پورا شہر بھوکا سامنے تھا

ہمارا شہر اک شہرِ اداکاراں کہ جس میں
قبا میں عیب پوشیدہ تھے، شجرا سامنے تھا

اگر یہ حسن کا پردہ نہیں تو اور کیا ہے
کہ چہرہ اوٹ میں تھا اور غازا سامنے تھا

جب آیا نیک و بد میں فیصلے کا وقت باقرؔ
ہمیشہ کی طرح منکر فرشتا سامنے تھا

سارے در یک رنگ ہیں بامِ دگر ملتا نہیں
جس کی خوشبو آ رہی ہے اس کا گھر ملتا نہیں

ریزہ ریزہ حرف چن کر ہو چلی زخمی نگاہ
جس میں معنی ہوں وہ حرفِ معتبر ملتا نہیں

کچھ پرندے ایسے قابض ہو گئے ہیں فصل پر
باغ جن کا ہے انھیں کوئی ثمر ملتا نہیں

مجرموں کی قبر پر جھوٹی شہادت کے مزار
اور شہیدوں کے لیے اک نوحہ گر ملتا نہیں

سانسوں کی خوشبو سے میری مہک اٹھا مرا گاؤں
بچھڑی مٹی لہک لہک کر چومے میرے پاؤں

تم ہی کہو پنچھو یہ کوئی دیس ہے یا پردیس
باپ کی جیسی دھوپ جہاں کی، ماں کی جیسی چھاؤں

کوئی مورکھ ہی ہوگا جو کرے گا اس سے بیر
جس دھرتی پر چلا ہو اک دن مُنّے مُنّے ماؤں

دھول بھری پگڈنڈی تو ہی بھر دے میرے گھاؤ
پکے رستوں پر چل چل کر چھل گئے میرے پاؤں

پل بھر میں بھولے بسرے موسم کو لوٹ گئے
مہوے کی ڈالی سے جوں ہی کاگا بولا کاؤں

اپنے اپنے گھر رہ کر بھی کر سکتے ہو پیار
سندھ کنارے ٹھٹھہ ہو یا گنگا پار سوراؤں

اونچے سے ٹیلے پر چڑھ کر ایک منش گھرائے
بستی میں تیرا بالک ہوں، باقر میرا ناؤں

maablib.org

ذکر کیوں صرف سائبان کا تھا
وہ بھی حصہ مرے مکان کا تھا

تیر پہچانتے تھے دشمن کو
یا کرشمہ تری کمان کا تھا

وہی سودا قبول کرنا پڑا
فائدہ جس میں پاسبان کا تھا

کسی مٹھی میں تھا نہاں موتی
یا ابھی تک مرے گمان میں تھا

اس میں کیوں شہر بھر دخیل ہوا
جو مرے تیرے درمیان کا تھا

پھول کے ساتھ ہم بھی کھل اٹھے
معجزہ کیا ترے بیان کا تھا

درمیاں کوئی مسئلہ تو نہ تھا
مسئلہ صرف اس کی آن کا تھا

کل وہ باقر زمین پر تھا رواں
اک ستارہ جو آسمان کا تھا

بغیر اِذن کوئی لفظ بولتا نہیں وہ
مگر وہ کون ہے یہ راز کھولتا نہیں وہ

تمام رات تو کرتا رہا شکایتِ شب
سحر ہوئی ہے تو کیوں آنکھ کھولتا نہیں وہ

مہک وہی ہے وہی رنگ روپ ہے پھر بھی
مرے مزاج میں اب رنگ گھولتا نہیں وہ

ہوئے ہیں منکشف اُس پر زر و جواہر یوں
اب اپنے آپ کو پھولوں میں تولتا نہیں وہ

تمہارے سامنے کیا نغمہ ریز ہو باقرؔ
کہ گرم ریت پہ شبنم تو رولتا نہیں وہ

موسمِ گل کے نام پہ کیا عیاری کرتا ہے
خزاں کے جھوٹے رنگوں سے گل کاری کرتا ہے

وقتِ ورود سے اب تک اس کی آنکھیں کھلیں نہیں
پھر بھی روز تماشائے بیداری کرتا ہے

خود تو نرگس کا بھیس بدل کر چمن چمن لہرائے
گر ہو سچا عشق تو کاروکاری☆ کرتا ہے

جس کو دیکھ کے چہرہ دمکا، آنکھیں سبز ہوئیں
شیشۂ دل پہ وہ کیسی زنگاری کرتا ہے

☆ غیرت کے نام پر قتل

کوئی تو زخم سے پیدا کرلے تن کے لیے سکون
کوئی نعمت کو دل کی بیماری کرتا ہے

دو دن کی زینت ہو کر مرجھا جاتا ہے پھول
اس کے لیے موسم کتنی تیاری کرتا ہے

خوشبو، رنگ اور پھول کھلا کر دل کو چمن بنا
کیوں مردہ ڈھانچوں کی اسے الماری کرتا ہے

کوئی بھی ہو، بس مری نظر میں سب سے بڑا کافر
وہ جو خلقِ خدا کی دل آزاری کرتا ہے

باقرؔ تم کو زیب نہیں دیتا مجمعے کا کھیل
سچ پوچھو تو ایسے کام مداری کرتا ہے

شبنم کے قطرے میں ڈھونڈا برف کے پارے میں
ٹھنڈک شاید چھپی ہوئی ہے اک انگارے میں

دل کے ریگستان میں پھوٹے کبھی کوئی چشمہ
منت کا سکہ ڈالا ہے اک فوارے میں

اپنی پیاری دھرتی کو ہم دھواں دھواں کر کے
پانی ڈھونڈنے نکلے ہیں بنجر سیارے میں

نخلِ جوانی کر آئے ستی کے دیس کو دان
کھیل کھلونے بہا دیے گنگا کے دھارے میں

برج تھا اپنا اچھا لیکن بگڑ گئی تھی چال
اب مستقبل ڈھونڈ رہے ہیں نئے ستارے میں

تیز کنارے کھڑا ہوا ہوں کیسے سنہرے بال
لہروں کو اب کیا بتلاؤں اپنے بارے میں

یہی تو ہم کو لے جائے گا اُڑا کے اس کے پاس
ہم نے اپنی جان بھری ہے اک غبارے میں

تازہ ہوا، مٹھی بھر تارے، موتی موتی رنگ
عیب کسی پہ ہنر بھی ہیں کچھ باقرؔ پیارے میں

یارو تمھارا اپنا کوئی گھر نہیں ہے کیا
اچھا تو پھر قریب سمندر نہیں ہے کیا

قیدِ صدف سے کوئی چھڑاتا نہیں ہمیں
ان ساحلوں پہ کوئی شناور نہیں ہے کیا

سجتا نہیں زمین پہ چلنا پرند کو
ان بازوؤں میں تیرے کوئی پر نہیں ہے کیا

خوش خوش چہکتے پھرتے ہو ہر شام شہر میں
پیارے تمھارا کوئی برادر نہیں ہے کیا

اُڑتا نہیں ہوا میں، پڑا ہے زمین پر
شانے پہ خاک زاد ترے سر نہیں ہے کیا

کیا بات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کبھی
بستی میں کوئی تیرے برابر نہیں، ہے کیا

کرتے ہو روز بحث بہت شہر یار سے
باقرؔ تمھارے دل میں کوئی ڈر نہیں ہے کیا

maablib.org

خوب دعا دی تم نے یار
ٹوٹ گئے مرے سارے تار

اُس سے کیا رکھیں اُمید
مایا ہو جس کی اوتار

ہتھیاروں کی بات نہ کر
ہم ٹھہرے شعروں کے سنار

ہونے لگیں جب دل سونے
پچکاری رنگوں کی مار

maablib.org

آ اے کالی رات تجھے
پہنا دیں جگنو کے ہار

دونوں جانب ننگے لوگ
بیچ میں شیشے کی دیوار

مر جانے دو عاشق کو
روز ہی رہتا ہے بیمار

کاٹنے آئے ہاتھ کوئی
فصل ہوئی پک کر تیار

ساحل پر موتی چگنے
آتی ہے پریوں کی ڈار

اور تجھے کیا ملنا ہے
دیکھا کر اُن کی رفتار

بولو صاحب حکم کرو
ہم جنتا اور تم سرکار

تم سے خفا ہو سکتے ہیں!
تم ہی تو ہو اپنا سنسار

کشتی میں کر کے سوراخ
ہم کو بُلاتے ہو اُس پار

کوئی مہکتی غزل لکھو
دُکھ کی باتیں چھوڑ یار

لندن میں ہیں خواب مرے
اور میں کراچی میں بیدار

دکھ کے خط مت لکھا کر
بھیجا کر بوسوں کے تار

جھوٹے منہ ہی کہہ کر دیکھ
باقرؔ اُڑنے کو طیار

تحریر کیا جائے نہ تقریر کیا جائے
پھر کیسے خیالات کو زنجیر کیا جائے

تبدیلیِ دل بھی تو کسی کام نہ آئی
اب سوچیے کیسے اسے تسخیر کیا جائے

لکھ پائے ہیں الفاظ کہاں دل کی کہانی
اب کیوں نہ اسے نبض سے تحریر کیا جائے

کہنا ہے اگر کچھ تو محبت کی زباں میں
اب کیا ترا اے بُرشِ شمشیر کیا جائے

ہے جنگ ستاروں میں، بجھا جاتا ہے سورج
اس خواب کو کس بات سے تعبیر کیا جائے

اس کا تو کوئی حرف بھی ہم کو نہیں منظور
تقدیر کو کیا کاتبِ تقدیر کیا جائے

یہ عمر ہے اور جیب میں اک نقشِ جوانی
باقرؔ تمھیں کس رنگ میں تصویر کیا جائے

maablib.org

سوچو تو وہ گھر کیسا ہے کیسا گھر کا والی ہے
جس کے ایک طواف میں ہم نے پوری غزل کہہ ڈالی ہے

جتنا چاہو روکو آخر تازہ ہوا تو پہنچے گی
جس گھر میں کوئی کھڑکی ہے اور جس دیوار میں جالی ہے

اپنے باغ کو دیکھو تو ہر پیڑ جلا ہر پھل سوکھا
اس کے گاؤں کی بات ہی کیا، ہریالی سی ہریالی ہے

جیسے کٹ ہی جائیں گے موسم جیسے بلا ٹل جائے گی
اس نے بس کچے پتھر کی اک دیوار اٹھالی ہے

جس نے کسی کی نقل اُتاری گویا اُس نے جھوٹ لکھا
جس نے سچ لکھا اس نے اپنی طرز نکالی ہے

آنکھوں میں مری گُل کھلتے ہیں سانس سے خوشبو آتی ہے
میرے بدن کے باغ کا دیکھو کیسا اچھا مالی ہے

ہاں وہی جس کے بال کی اک اک لٹ میں جگنو بجتے ہیں
روپ میں جس کے رنگ کی ہولی آنکھوں میں دیوالی ہے

تیز ہوا میں ڈر لگتا ہے کہیں لچک کر ٹوٹ نہ جائے
اور سراپا کیا لکھوں بس نازک پھول کی ڈالی ہے

جس کو سہرا باندھ کے ہم اُس رات اٹھا کر لائے تھے
موم کی وہ پُتلی اب اپنے سانچے میں پگھلالی ہے

جس کو دیکھ کے پھول کھلے اور جس کو چھو کر رنگ چڑھے
ہم نے بھی کچھ سوچ کے باقرؔ اُس سے گرہ بندھوالی ہے

فلک سے کہہ دو

فلک سے کہہ دو
ہمیں یقیں ہے
ہمارے شام وسحر ہمیشہ تو ایک جیسے نہیں رہیں گے

طویل راتیں ہمیشہ رہنے کے واسطے تو نہیں بنی ہیں
ضرور اک دن طلوعِ خورشید اپنی کرنوں کی برچھیوں سے
سیاہ بے مہر شب کے گہرے دبیز پردوں کو ریشہ ریشہ بکھیر دے گا

ہمارے جھلسے چمن کے ہر اک خزاں چشیدہ شجر کی بے رنگ ٹہنیوں پر
ضرور اک دن
نئی نئی خوشبوؤں کی حسین پریاں
نئے گلوں کے لباس میں
رقصِ رنگ اور بو کریں گی

اسے تو معلوم ہے
کہ دریائے نیل کی نرم ہلکی لہروں نے
کس کی افواجِ قاہرہ کو مذلتوں کی اندھیری قبروں میں جا اُتارا

ہوا کی مانند آب کی کوئی ایسی رنگت کہاں ہوئی ہے
تو پھر ہمیشہ کا صاف آبِ فرات و دجلہ بھی خون جیسا نہیں رہے گا
کہ ٹیمز، ہڈسن کے پانیوں کا بھی رنگ ایسا نہیں رہے گا

فلک سے کہہ دو
وہ دن بہت دور بھی نہیں ہے
کہ جب فلک خود زمین کی پستیوں میں ہوگا
کبھی ہمارے بھی دن پھریں گے

maablib.org

کی قیامت دل آرام نے
صرف بیٹھا رہا سامنے

رات بے لطف بے نور تھی
کیسا رسوا کیا شام نے

خوں بہاؤ مرے نام پر
کب کہا، کب کہا رام نے

تھے برہنہ گناہوں سے ہم
لاج رکھ لی کچھ احرام نے

maablib.org

تھا دواؤں کا اثر ہوش میں آتا کیسے
اپنے کاندھے پہ چڑھے بت کو گراتا کیسے

خود مرے گوشۂ دامن سے نکلتا تھا دھواں
اپنے ہمسائے کی میں آگ بجھاتا کیسے

انگلیاں میری چراغوں کی طرح روشن تھیں
اہلِ ظلمات سے میں ہاتھ ملاتا کیسے

اس کو اپنے لب و رخسار کی سرخی تھی عزیز
سبز آنچل نہ ہواؤں میں اڑاتا کیسے

موتیوں سے مرے احباب نے منھ اس کا بھرا
پھر وہ میرے لیے آواز اٹھاتا کیسے

ایک انسان ہوں میرے کئی چہرے تو نہیں
روتا اپنے لیے اس کے لیے گاتا کیسے

دانت میری رگِ گردن میں تھے پیوست اس کے
ایسے حالات میں ہاتھ اپنے چھڑاتا کیسے

maablib.org

آج کا دن بہت اچھا گزرا
ایک ہنستا ہوا چہرہ گزرا

باغ پر چھائی رہی دھند تو کیا
پھول پر پھول مہکتا گزرا

ہر رگِ سنگ سے چشمہ پھوٹا
کیا ادھر سے کوئی پیاسا گزرا

رات سی رات کہ ٹھہری ٹھہری
یہ بھی کیا دن ہے کہ گزرا گزرا

وقت بس کٹ گیا کٹتے کٹتے
تیرا گزرا ہے نہ میرا گزرا

چاندنی خوف سے چھپتی پھرتی
جن اندھیروں سے اندھیرا گزرا

میری بستی سے تو گزرا چپ چاپ
ساری دنیا پہ برستا گزرا

یاد باقر کی بہت آئی جب
کوئی بہتا ہوا تنکا گزرا

maablib.org

اے میری پیاری اے میری بہنا اب یہ آنسو پونچھ بھی لے
پھر لادیں گے زیور گہنا اب یہ آنسو پونچھ بھی لے

زخموں کا رنگیں پیراہن اور مالا انگاروں کی
تیری خاطر کیا کچھ پہنا اب یہ آنسو پونچھ بھی لے

ہم کو تو بس تیرا ہنستے رہنا اچھا لگتا ہے
دل پر شاق ہے ان کا بہنا اب یہ آنسو پونچھ بھی لے

کس کو دل کی بات بتائیں کیسے تیرے زخم سئیں
دینے لگے ہیں لوگ اُلہنا اب یہ آنسو پونچھ بھی لے

پھر سے تیری مانگ سجے گی وصل کے دن لوٹ آئیں گے
مان لے باقر بھائی کا کہنا اب یہ آنسو پونچھ بھی لے

maablib.org

عجیب خدمتِ شہرِ بہار کرتے رہے
خود اپنے صحن میں گُل کا شکار کرتے رہے

بس ایک تار ہی تھا پیرہن میں موجبِ رنگ
اس ایک تار کو ہم تار تار کرتے رہے

چھپا ہے دل میں جو ابلیس اس سے عشق کیا
ستونِ سنگ کو ہم سنگسار کرتے رہے

کبھی نہ غسل کیا اور نہ پیرہن بدلا
ہمیشہ اک نئی خوشبو سے پیار کرتے رہے

در اصل جن پہ فقیروں کا پہلے حق ہوتا
وہ سارے جرم فقط تاجدار کرتے رہے

ہماری سوچ بھی بیمار آنکھ بھی بیمار
سو چاندنی کو بھی ہم سوگوار کرتے رہے

وہ قریہ ہے جو فقط سنگ و خشت کا جنگل
ہم اس کو شہر کی صف میں شمار کرتے رہے

وہ انتظار کہ پنہاں ہو جس میں وصل کا رنگ
اس انتظار کا ہم انتظار کرتے رہے

maablib.org

سیارہ

اور کچھ سنا تم نے
آج اک نجومی نے
اور ایک سیارے، کا سُراغ پایا ہے
جانے کتنی صدیوں سے
یہ غریب سیارہ
بے کراں خلاؤں میں
بے شمار سیاروں، کے طواف میں گم تھا

اتنی دور کیوں جاؤ
خود ہماری دنیا میں، صد ہزار سیارے
صد ہزار برسوں سے
بے شعاع و بے رونق،
سورجوں کے نرغے میں، خوار ہو گئے لیکن
کب کسی نجومی نے
ان کو ڈھونڈنا چاہا

maablib.org

کُوڑے کی ڈھیری

میں وقتِ صبح کل جب سیر کو نکلا
تو میرے راستے میں اک کنارے پر کسی بلّی کا مردہ جسم تھا
اور مکھیوں کا ایک جھرمٹ تھا

وہاں سے دس قدم آگے تعفّن سے بھری
کوڑے کی ڈھیری پر
کسی انسان کا میلا کچیلا جسم تھا
اور مکھیوں کا ایک جھرمٹ تھا

مگر اس سے بڑا تو سانحہ یہ ہے
کہ وہ میلا کچیلا جسم اک جاروب کش کا تھا
جو تھک کر سو گیا تھا

maablib.org

گنگا دین

پیارے گنگا دین! دین! دین!
میں نے تجھ کو مارا پیٹا
تجھ پر ظلم کیا
تیری جذامی جلد ادھیڑی
تو نے اف بھی نہ کی
قسم ہے زندہ خالقِ کل کی
جس نے تجھ کو خلق کیا
تو مجھ سے بھی افضل نکلا
پیارے گنگا دین

maablib.org

جو اک سر پہ بہت سی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہے
سمجھتا ہے کہ وہ سارا جہاں پہنے ہوئے ہے

وہ بادل ہے تو پیاسوں پہ برستا کیوں نہیں ہے
نہیں بادل تو پھر کیوں بجلیاں پہنے ہوئے ہے

لباسِ ناقہ پہ یہ نقش و آرائش نہیں سب
ثبوتِ ظلم و جورِ سارباں پہنے ہوئے ہے

ہمیشہ اس کو پیچھے ہاتھ باندھے دیکھتے ہیں
ہمارا سورما کیا چوڑیاں پہنے ہوئے ہے

ہمیں تو ایک خدمت کا ستارہ نامیسّر
وہ نامعقول ساری کہکشاں پہنے ہوئے ہے

یہ خوش فہمی ہمارا سب سے مشکل مسئلہ ہے
کہ بس اک رنگ سارا کارواں پہنے ہوئے ہے

قفس سے کچھ عقیدت ہو گئی اتنی کہ اب وہ
ثوابا کچھ قفس کی تیلیاں پہنے ہوئے ہے

ملو جس سے متاعِ صبر کی لذت سے عاری
جسے دیکھو ہوس کی بیڑیاں پہنے ہوئے ہے

جذامی جسم پر رنگیں قبائے خودنمائی
زباں ہے گنگ لیکن داستاں پہنے ہوئے ہے

یہ ریگستان ہے اس میں نہ بستی ہے نہ گلشن
بگولہ تہہ بہ تہہ کیوں آندھیاں پہنے ہوئے ہے

نہیں میرے قریں رنگیں کفن سے کچھ زیادہ
وہ پیراہن جو سارا گلستاں پہنے ہوئے ہے

طلب گھر کی نہ ہجرت کا تکلف ہے کہ باقرؔ
پرندہ ہے اور اپنا آشیاں پہنے ہوئے ہے

بہت بڑھ گئے ہیں اندھیرے کے بال
نکال اپنی کرنوں کی قینچی نکال

گہن میں ہو جب بھی مقدر کا چاند
بدل اپنا گھر اور چل کوئی چال

موافق نہیں گردشِ روز و شب
نئے کچھ ستارے خلا میں اُچھال

بنے کام سب کیسی رفتار سے
یہ دولت کے پہیوں کا دیکھو کمال

وہ سب کام جو کارِ شیطان ہیں
انھیں سے ہے شہرت انھیں میں ہے مال

بہم ہوگئیں کتنی آسانیاں
نہ رونے کی مشکل نہ مرنا محال

پلٹ آئیں گے دن پھر اصنام کے
رہا گر یہی اہلِ ایماں کا حال

نہیں کوئی بھی چیز دائم یہاں
تمھارا عروج اور نہ میرا زوال

ٹھکانا وہی ایک سونا قفس
مقدر ہمارا وہی ایک جال

maablib.org

شہرت کی ہم سفر تو ہے دشنام کی بھی ہو
ساتھی کوئی شبیہ پسِ شام کی بھی ہو

پوری تو ہو چکی ہیں بھلی خواہشیں تمام
لذت اس عمر میں کوئی الزام کی بھی ہو

ہر کام مہوشوں کے لیے التفات کا
صورت کوئی حریفوں کے آرام کی بھی ہو

ہے بندشِ دریچہ و در ختم کے قریب
کھڑکی کھلی ہوئی کبھی اُس بام کی بھی ہو

سنتے رہے ہیں دردِ قفس کی شکایتیں
کچھ بات آج دانۂ بے دام کی بھی ہو

کچھ اور شہرِ فن سے توقع نہیں ہے، بس
تختی کسی گلی پہ مرے نام کی بھی ہو



میں باقر نقوی سے معمولی سی واقفیت کا دعویٰ بھی یا اعتراف نہیں کر سکتا۔ انھیں لندن میں ایک آدھ مرتبہ سنا ہوگا، وہ بھی رواروی میں۔ لیکن ان کی جو غزلیں مجھ تک پہنچی ہیں، انھیں ایک اہم احتجاجی شاعری نہیں، ایک بڑا امکان تسلیم کرنے پر مجبور کر رہی ہیں..... یہ آدمی غزل میں انسانی جدوجہد کی تاریخ کیسی دل میں اُتر جانے والی اور حوصلہ بڑھا جانے والی تلخی کے ساتھ بیان کرتا ہے... غزل کی مخصوص جمالیات میں انقلاب کے آداب کس اعتماد، کس دانش کے ساتھ برتتا ہے... ہماری پرانی زبان میں کس قدر انقلابی کے ساتھ، کس قدر تلخ، کتنی سچائی کے ساتھ تیغ ہو جاتا ہے... ایسے کاٹ دار لہجے کا شاعر جب پورے قد و قامت کے ساتھ سامنے آ کر آواز لگاتا ہے تو... تو بڑے بڑے پہاڑ ہل جاتے ہیں۔

جمیل الدین عالی

... باقر نے ہوا، پرندہ، پھول، گرد، دریا، دھوپ اور برف کو جس طرح تلازمۂ خیال کے لیے استعمال کیا ہے، اس میں ہر لفظ ایک نئی معنویت اور ماضی و حال کی زندگی کے ممکنات ڈوبتے اُبھرتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی غزلیں زبان و بیان دونوں کی نئی معنوی جہتیں اُبھارتی جاتی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عقیل رضوی

باقر نقوی اندرونی گھٹن کا شاعر ہے، اس کے لیے شاعری کرنا ایک باطنی مجبوری ہے۔ بقول ژونگ کوئی بھی تخلیق کار اپنی تخلیقی اُپج سے زیادہ طاقتور نہیں ہوتا۔ وہ غزل کی کلاسیکی اور جدید روایت سے پوری طرح آشنا ہے مگر اپنی روز افزوں مصروفیتوں کے باوجود وہ شاعری کی گرفت سے کسی پہلو سے بھی آزاد نہیں ہو پاتا۔ زندگی کا ہر تجربہ اس کے لیے شاعری کا موضوع ہے۔ وہ زندگی کو کھلا امکان سمجھتا ہے اور بھرپور زندگی گزارتا ہے، شب و روز کے دکھوں اور سکھوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہوئے۔

شہزاد احمد

باقر نقوی ایک دھیمے، خوش ذوق، خوش خو، دل آویز، مخلص اور پُرکشش انسان ہیں۔ بعض اوقات اُن کی شاعری پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے مرنجاں مرنج نظر آنے والے انسان کے احساسات، فکر اور لہجے میں ایسی شدت، کاٹ اور چیزوں کے باطن میں اُتر کر انھیں دیکھنے کی ایسی زبردست بصیرت کہاں سے در آئی ہے! اُن کے اندر کا شاعر باقر نقوی ایک ایسا دلیر، پُرجوش اور روایات کا باغی انسان ہے جو معاشرتی ناہمواریوں، دولت اور مراتب کی غیر منصفانہ تقسیم اور انسان کے انسان پر ظلم اور استحصال کے خلاف صرف سوچتا ہی نہیں بلکہ اپنی اس سوچ کو زمانے بھر میں پھیلانا اور پھر اس کا مثبت نتیجہ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے معاشرے سے اسی گہری کمٹ منٹ کا نتیجہ ہے کہ اتنے برس وطن سے دور رہنے کے باوجود بھی باقر نقوی کی شاعری میں کہیں بھی کسی بھی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ بلاشبہ شاعروں کی اُس نمائندہ واقفیت سے تعلق رکھتے ہیں جس کے حوالے سے کسی دور کو پہچانا اور پرکھا جاتا ہے۔

امجد اسلام امجد

دامن (کلیات شعری) باقر نقوی